اُردو شاعری کا بہترین انتخاب اور اردو شعراء پر

ایک اجمالی تبصرہ

روحِ نظم

جلد اوّل

مُرتّبہ

مولینا تاجور نجیب آبادی ایڈیٹر اتحاد پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور

پنڈت میلارام وفا جرنلسٹ ایڈیٹر بھارت لاہور

شمشیر سنگھ اینڈ کمپنی پبلشرز کچہری روڈ لاہور

دیباچہ

یہ سچ ہے کہ شاعر فطرۃً شاعر ہوتا ہے اور شعر گوئی کی قابلیت انسان میں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا کرتی ہے۔ مگر شعر فہمی کی استعداد کوئی ایسی بات نہیں۔ جو اکتساب سے حاصل نہ ہو سکے۔ اردو بولنے اور سمجھنے والوں کے سوا دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس کے ناخواندہ افراد بھی اپنی زبان کی شاعری کا لطف صحیح طور پر نہ اٹھا سکتے ہوں۔ اور اپنے شعرا کے کلام کا حسن و قبح پرکھنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔ یہ دوسری قوموں کے اسی عام ذوق شعری کا نتیجہ ہے۔ کہ اُن کی ترقی یافتہ شاعری ملک و قوم کے لیئے مفید ثابت ہو رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو شاعری خدانخواستہ رُو بہ زوال یا پذیر ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کا دورِ جدید باعتبار اسلوب بیان و لطفِ زبان اور بلحاظ ندرتِ خیالات و عمقِ جذبات بہیئت مجموعی دورِ قدیم پر ایک نمایاں پیش قدمی ہے لیکن اس دعوی کا اطلاق صحیح پختہ مشق اور نغز گو شعرا تک محدود ہے۔ جو اپنی ذمہ واریوں کو ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بالاتر ہو کر محسوس کرتے ہیں۔ اور تحسین ناشناس و سکوتِ سخن شناس کو قدر نشناسی جنسِ شعر سمجھ کر کبیدہ خاطر نہیں ہو جاتے۔ بلکہ ترقی کے ان امکانات سے پورا فائدہ اٹھانے اور ان کو نشو و نما دینے کے لئے کوشاں رہتے ہیں جو اردو زبان کا فطری خاصہ ہیں۔ ورنہ اپنے فورتھ ریٹ شعرا کی کثرت تعداد کو دیکھ کر ہمارا سر شرم کے مارے جھک جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے شعرا کی کثرت کا باعث یہ ہے کہ جہاں دوسری اقوام کے عام افراد کا صحیح ذوق شعری ان کے شعرا کو جادۂ صحت پر ڈال دیتا ہے۔ وہاں ہمارے عام شعرا اس ذوق شعری کی صحیح رہنمائی اور اسکے اصلاح بخش اثرات سے محروم رہتے ہیں۔ اور مہمل سرائی و بے ضابطہ نوائی کی دلدل سے عمر بھر نہیں نکلنے پاتے۔

اس صورت حالات کا زیادہ افسوسناک اور حوصلہ شکن پہلو یہ ہے۔ کہ صحیح ذوق شعری کا یہ فقدان اردو دان دنیا کے عامۃ الناس ہی کا خاصہ نہیں۔ بلکہ ہمارے گریجوایٹ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خواص بھی اکثر و بیشتر اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ بات یہ ہے۔ کہ وہ مڈل سے لے کر غالبؔ کے اشعار پڑھتے

چلے آتے ہیں۔ حالانکہ غالب کے اشعار سے لطف اندوز ہونا تو ایک طرف۔ وہ انہیں سمجھنے کی استعداد بھی نہیں رکھتے۔ اور طلبہ ہی پر کیا موقوف ہے۔ مڈل اور انٹرنس کے ٹیچروں میں بھی بہت کم ایسے ہیں جو انہیں سمجھا سکیں۔ کیونکہ اپنی جگہ پر ان کی تعلیم بھی اسی طرح ناقص ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جب طلبہ کالجوں کے اعلیٰ درجوں میں آتے ہیں۔ اور یہاں بھی غالب اور میر وغیرہ کے عموماً وہی اشعار اپنے کورسوں میں دیکھتے ہیں۔ جنہیں وہ ثانوی درجوں کے کورسوں میں پڑھ آئے ہیں۔ تو انکا دماغ چکرا جاتا ہے۔ اور جہاں تک اشعار کے مطالب کی تہ کو پہنچنے کا تعلق ہے وہ محض کورے رہ جاتے ہیں۔ بلکہ اگر ان کے سامنے ناموزوں اشعار پڑھ دئے جائیں۔ تو بھی ان کے کان کھڑے نہیں ہوتے۔ نفسِ شعر کے متعلق ان کے فہم و ادراک کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ اگر برے سے برا شعر بھی خوش الحانی کے ساتھ پڑھ دیا جائے۔ تو وجد کرنے لگتے ہیں۔ اور اگر اچھے سے اچھا شعر تحت اللفظ میں ادا کیا جائے۔ تو ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ گویا ان کے نزدیک شاعر وہی ہوتا ہے۔ جو اعلیٰ درجہ کا خوش گلو مغنّی بھی ہو۔

یہ کور سوادی یہاں تک بڑھ گئی ہے۔ کہ اگر کوئی چٹخارے دار نثر بھی ترنم میں پڑھ دی جائے تو جھوم جاتے ہیں۔ اس نقص کے ذمہ وار بہت حد تک ان کے ابتدائی اردو کورس قرار دئے جا سکتے ہیں۔ لیکن موجودہ طرز کے مشاعروں نے بھی انہیں کور ذوق بنانے میں کم حصہ نہیں لیا۔ ان مشاعروں سے جہاں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اردو زبان ہر دل میں گہرائی حاصل کر رہی ہے۔ وہاں یہ نقصان بھی نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ کہ اردو شاعری عوام کے رجحانِ طبع سے متاثر ہو کر خطرناک حد تک ابتذال پذیر ہوتی چلی جاتی ہے اب ہر شخص جو ان مشاعروں میں شامل ہوتا ہے۔ اپنے طور پر یہ سمجھے ہوئے ہے کہ شاعر نہ ہونا تعزیراتِ ہند کی کسی دفعہ کی زد میں آجاتا ہے۔ جسے دیکھو ایک تخلص کا گنہگار بنا پھرتا ہے اردو دنیا میں شعر گوئی ہیضے کی طرح پھیل رہی ہے۔ مگر شعر فہمی اسی رفتار سے عنقا ہوتی جاتی ہے اس ادبی طوفانِ بے تمیزی کا یہ اثر ہے۔ کہ ہماری شاعری خس و خاشاک کا ایک انبار بن کر رہ گئی ہے۔ اس انبارِ سوختنی میں اردو شاعری کے جاں فروز شہ پارے بھی پنہاں ہیں جن کی تمام تابانیوں کو رطب و یابس ہفوات کے ذخیروں نے چھپا رکھا ہے۔ ہم نے اردو کی تعلیمی ضرورتوں کے احساس سے اس انبار کی چھان بین شروع کی۔ اور کان کنوں کی سی زحمتیں برداشت کر کے ان تودہ ہائے خاک سے یہ زرِ خالص نکال کر ہنر شناس نگاہوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

ان منتخبات کی تالیف میں امور ذیل کو مدِ نظر رکھا گیا ہے:-

(۱) اردو شاعری اور اُس کے اہم شعبوں پر ایک اجمالی تاریخی تبصرہ۔

(۲) ہر شعبۂ شاعری پر ایک مجمل تاریخی تنقید ہے کے ساتھ اسکی عہد بہ عہد کی تبدیلیوں اور ارتقائی حیثیات پر ایک چھچلتی نظر ڈالتے ہوئے اس شعبے کے مشاہیر سحر طرازوں کے نام۔ ان کے خصوصیاتِ شاعری۔ اور اس صنفِ سخن کے تحت میں تفحص و تجسس کے بعد ان کے شہ پاروں کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔

(۳) ہر شعبۂ شاعری میں شعرا اور ان کے کلام میں تقدّم و تاخر کے اعتبار سے ترتیب تاریخی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۴) اصناف سخن میں سے مثنوی۔ قصیدہ۔ مرثیہ جدید نظمیں۔ غزلیات اور رباعیات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ کہ یہی اصناف اردو شاعری میں اہم ہیں۔

(۵) آغاز سے اختتام تک ایسے اشعار یا نظمیں جن میں ابتذال۔ عُریانی۔ جذبات کی پستی۔ خیالات کی فرسودگی۔ صنعتی تکلفات کی جھلک موجود تھی۔ احتیاط کے ساتھ انتخاب سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔

(۶) عموماً مسلم الثبوت اساتذۂ قدیم و جدید کا کلام منتخب ہوا ہے۔ البتہ جدید شعرا میں بعض ذی استعداد اور نغز گو حضرات کی چند ایسی نظمیں لے لی گئی ہیں۔ جنہیں اردو شاعری پر ایک مفید اضافہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔

(۷) روحِ نظم کا پہلا حصّہ اِس خیال کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ کہ معمولی استعداد کے شائقین میں شعر و شاعری سے لطف اندوز ہونے کا صحیح ملکہ پیدا ہو جائے۔ دوسرے حصّے کی ترتیب میں ان کے بڑھے ہوئے ادبی ذوق کی رعایت رکھی گئی ہے۔ دوسرا حصّہ پہلے حصّے سے دشوار فہم ہے اردو قصائد جو اصنافِ نظم میں سب سے زیادہ استعداد طلب ہیں۔ ارادۃً دوسرے حصے میں درج کئے گئے ہیں۔

بحالاتِ موجودہ ہماری تعلیمی اور پبلک لائبریریوں کے علاوہ اردو کے تجارتی بکڈپو بھی ایسے منتخبات سے قریب قریب خالی ہیں۔ جن میں اردو کے مرحوم اور زندہ مشاہیر شعرا کی سحر طرازیوں کے بہترین نمونے متذکرہ بالا التزامات کے ساتھ یکجا کئے گئے ہوں۔ پھر اگر ہم ملک کے طول و عرض میں ادبی کور ذوقی کا ایک طوفانِ بے تمیزی برپا دیکھتے ہیں۔ تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ کسی قوم میں شعر فہمی کا ذوق پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک اسکے عام افراد کو اپنے مستند شعرا

کا کلام دیکھنے کی سہولتیں میسّر نہ ہوں - اور اُنہیں یہ جاننے کا موقع نہ ملے کہ اُن کی شاعری کون کون سے ارتقائی مدارج میں سے ہو کر موجودہ حالت کو پہنچی ہے اور ان کے مختلف اساتذہ کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں - اسی ضرورت کو محسوس کر کے ہم نے یہ دو حصّے مرتّب کئے ہیں -

اِن دونوں حصوں کو پڑھنے کے بعد اردو شاعری کی ارتقائی حیثیت نظر کے سامنے آ جاتی ہے اور تعمق نظر سے ان کا مطالعہ پڑھنے والے میں ایک صحیح ادبی مذاق اور شاعرانہ ملکہ پیدا کر سکتا ہے - اسکولوں کے ورنیکولر ٹیچر آرٹس کالجوں - ٹریننگ کالجوں اور نارمل اسکولوں کے طلبہ بھی بقدر استعداد ان سے مستفید ہو سکیں گے -

تاجور نجیب آبادی ایڈیٹر اخبار اتحاد

پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور

میلا رام وفاؔ جرنلسٹ

ایڈیٹر "بھارت" لاہور

فہرست روحِ نظم حصہ اوّل

۶ - اردو نظمیں

مثنوی

جتنی صنفیں آج کل اردو شاعری میں متداول ہیں ان میں کوئی صنف بھی نہ تو مثنوی سے زیادہ مفید ہے اور نہ وسیع۔ وجہ یہ ہے کہ تمام انواع اس میں آسانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادا ہو سکتی ہیں۔ سب سے بڑی بات جو مثنوی میں قابل قدر ہے وہ مضامین کا تسلسل ہے۔ اسی کا طفیل ہے کہ اس میں جذبات انسانی۔ مناظر قدرت اور واقعہ نگاری کے تمام حسین پہلوؤں پر نہایت آسانی کے ساتھ نظر ڈالی جا سکتی ہے۔

مثنوی کا ہر شعر الگ ہوتا ہے اس لئے وہ ان بندشوں سے آزاد ہے جن میں ہماری غزلیں اور قصائد گرفتار ہیں یعنی پوری نظم کا ایک نوع کے قافیوں میں ہونا۔

مثنوی کے لئے اشعار کی تعداد بھی محدود نہیں اور نہ مضامین ہی کی تخصیص ہے۔ ہر مضمون مثنوی کی لپیٹ میں آ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کا اثر تمام ایشیا پر چھایا ہوا ہے اور کوئی صنف شاعری مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے عربی شاعری فارسی شاعری سے بہت پیچھے نظر آتی ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ مثنوی کی ابتداء ایران میں کیونکر ہوئی۔ آیا اس کی ایجاد خود ایرانیوں کے تنہا دماغ کا نتیجہ ہے یا عرب کی شاعری کا کوئی نمونہ ان کے پیش نظر تھا یہ مسلّم ہے کہ عربی میں اُس وقت تک مثنوی کی مستقل صنف وجود میں نہ آئی تھی۔ البتہ رجز کو مثنوی کہا جا سکتا ہے جس کا ایک ایک شعر الگ الگ ہونے کے ساتھ ہی تسلسل کو بھی اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ عباسیوں کے زمانے میں عبداللہ بن المعتز نے شکار کے حالات رجز کے طور پر لکھے تھے۔ جن پر مثنوی کا اطلاق ہو سکتا ہے لیکن اس کا رواج عام نہ ہوا۔ اس لئے عربی شاعری بہت سے مضامین سے محروم رہ گئی۔

غرض یا تو خود ایرانیوں نے اسے ایجاد کیا یا پھر رجز کے نمونہ کو پیش نظر رکھ کر اس وسیع میدان میں قدم رکھا۔

ہمارے شعرا کے تذکرے ایسے خاموش ہیں کہ ہم یقینی طور پر نہیں بتا سکتے کہ مثنوی کا موجد کون تھا۔ اگر رودکی کو شاعری کا باوا آدم تسلیم کر لیا جائے تو مثنوی کی ایجاد کا سہرا بھی اسی کے سر رہتا ہے۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ رودکی نے نصر بن احمد سامانی کی فرمائش سے پہلے پہل کلیلہ دمنہ کا ترجمہ مثنوی میں کیا تھا۔ جس کا صرف نام ہی نام ہماری زبان پر ہے یا زیادہ سے زیادہ چند اشعار نمونہ کے طور پر کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔

اس کے بعد فارسی میں کثرت سے مثنویاں لکھی گئیں لیکن جس مثنوی نے دُنیا میں ہل چل ڈال دی وہ صرف فردوسی کا شاہنامہ ہے۔ یا پھر اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ سکندر نامہ نظامی ہے اور بس۔ یہ دونوں مثنویاں رزمیہ ہیں۔ ان مثنویوں نے اس قدر فروغ پایا کہ پھر کسی کا چراغ ان کے سامنے نہ جل سکا۔ لیکن میدان وسیع تھا اس لئے اس میں سے بہت سی شاخیں پھوٹ نکلیں۔ اور اس طرح عشقیہ۔ اخلاقی۔ قصہ و افسانہ اور تصوّف و فلسفہ کی مثنویوں کا تانتا بندھ گیا اور کثرت سے مثنویاں عالم وجود میں آگئیں۔

اُردو میں یہ صنف آئی تو عشقیہ رنگ لئے ہوئے ابتدائی زمانے میں قصہ و افسانہ میں خوب طبع آزمائیاں کی گئیں جن کے نمونے آجکل بھی تلاش سے جا بجا نظر آجاتے ہیں۔ لیکن جو مفید مضامین فارسی میں ادا کئے گئے ہیں اُن سے ہماری مثنویاں بالکل خالی نظر آتی ہیں۔ اور اگر ہیں بھی تو شاذ۔ شاعری کے ابتدائی دور میں بعض اخلاقی قصے نظم کی لڑیوں میں پروئے گئے ہیں لیکن ان کے کہنے والے ایسے لوگ تھے جن کو ہم مسلم الثبوت استاد نہیں کہہ سکتے۔ مثنوی کی صورت میں جو پرانی نظمیں ہماری نظر سے گزری ہیں ان میں ایک مثنوی "چندر بدن" بھی ہے جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور میں موجود ہے لکھنے والے کا

نام اچھی طرح پڑھا نہیں جاتا۔ کاتب نے تحریر کی تاریخ ۲ رذی الحجہ ۱۱۰۸ھ لکھی ہے۔ نمونہ یہ ہے ؎

کہاں یہ حکایت کہاں حال مجھ
کہاں یہ جوانی کہاں خیال مجھ
کہ عاشق ہؤا اس پری کا اسیر
لگا خاک کوں ہؤا جو فقیر
بچن اس موہن کا زباں پر ادنے
دھرایاد سب جا کے سرپرادنے
چلایوں جو کیتا ردا نہ ہؤا
کیتا کیا کوئی تو دیوانہ ہؤا

جس طرح اب تک متحقق نہ ہو سکا کہ اُردو کا پہلا شاعر کون ہے۔ اسی طرح اردو مثنوی کا آدم بھی پردۂ اخفا میں ہے۔ ابتک جتنی مثنویاں ہماری نظر سے گزری ہیں ان کو دیکھ کر صرف ۵ - ۶ ہستیوں پر نگاہ ٹھیرتی ہے۔ جن کو مثنوی نگار کہا جاسکتا ہے۔ میر تقی میر اردو شاعری کے مجدد ہیں اس لئے اردو میں مثنوی کی باقاعدہ بنیاد ڈالنے والے بھی ہم انہیں کو کہہ سکتے ہیں۔ میر صاحب نے چند عشقیہ مثنویاں اُردو میں لکھی ہیں۔ جن کو چند منظوم حکائتیں لکھنا زیادہ موزوں ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ انھوں نے مثنوی کی داغ بیل ڈال کر ہم کو بتادیا کہ مثنوی اس طرح لکھی جاتی ہے۔

جس زمانے میں میر نے مثنویاں لکھی ہیں اس وقت اُردو پر فارسیت چھائی ہؤئی تھی اور غالباً اردو میں کوئی قابل تقلید نمونہ ہمارے پیش نظر نہ تھا زبان بھی مثنوی کے لئے تیار نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میر کی مثنویوں پر فارسیت کا رنگ زیادہ چڑھا ہؤا ہے اور انصاف یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے میں مجبور بھی تھے اس زمانے میں اس سے بہتر زبان میں مثنوی لکھنا قریب قریب غیر ممکن تھا۔

میر صاحب کی مثنویاں زبان کے اعتبار سے گو کتنا ہی آجکل کے مذاق سے گری ہُوئی ہوں لیکن انہوں نے مثنویوں میں بیان کے انتظام اور تسلسل واقعات کو بالکل ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس کے علاوہ ان کی مثنویوں میں بہت سے صاف اور عمدہ شعر ایسے مل جائینگے جو آجتک لوگوں کی زبان پر چڑھے ہُوئے ہیں +

ان مثنویوں میں چند صحیح نما واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں نہ شادی کی دھوم دھام دکھائی گئی ہے اور نہ کسی منظر کا ٹھاٹھ باندھا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ نتیجہ خیز اور مہذب ہیں۔ میر تقی میر کے بعد میر درد کے بھائی میر اثر نے ایک مثنوی خواب وخیال کے نام سے لکھی اور خوب لکھی۔ سلاست و روانی اس میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ اس مثنوی کا ایک ٹکڑا جس میں معشوق کا سراپا لکھا ہے اپنی خوبی کی وجہ سے آجتک مشہور ہے اس کے بعد میر حسن دہلوی کی مثنوی "بدر منیر" عالم وجود میں آئی اور اس کو وہ شہرت حاصل ہُوئی۔ جو کسی مثنوی کو اس وقت تک حاصل نہ ہو سکی تھی۔ یہ مثنوی میر تقی میر کے رنگ سے جدا ہے۔ اس میں ایک فرضی قصہ نظم کیا گیا ہے اور اس کی پلیٹ میں قصہ نگاری کے تمام فرائض انجام دینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ جس واقعہ کو لکھا ہے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دی ہے +

بدر منیر کے بعد اس کی ریس میں کئی مثنویاں اور بھی لکھی گئیں ان میں جو زیادہ شہرت حاصل کر سکیں ان میں سے ایک پنڈت دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" ہے اس کی نسبت جو بات زیادہ مشہور ہے وہ اس کا اختصار ہے۔ لفظی التزام کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا اور پوری مثنوی استعاروں اور کنایوں کا طلسم بنی ہوئی ہے +

اس کے بعد ہی قلق نے مثنوی طلسم الفت لکھ کر استعاروں اور کنایوں کا پل باندھ دیا ہے۔ اس میں محلات شاہی کی زبان

کو نہایت خوبی سے نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ اس مثنوی کو اہل لکھنؤ
تمام مثنویوں کا سرتاج کہتے ہیں لیکن اہل نظر معیار پر کس کر سمجھ سکتے
ہیں کہ "بدر منیر" کے سامنے اس کا کیا پایہ ہے۔ ہاں اگر کسی کو بدر منیر
کے مقابلہ میں لایا جاسکتا ہے تو وہ مرزا شوق کی مثنویاں ہیں۔ اور بس۔
شوق نے یہ مثنویاں واجد علی شاہ کے اخیر زمانہ سلطنت میں لکھی تھیں
سوسائٹی کے اثر سے انکے اکثر مقامات غیر مہذب اور ان نیچرل ہو گئے ہیں
لیکن اگر ان کو شاعری کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان مثنویوں کو بدر منیر
پر ایک حد تک ترجیح دی جاسکتی ہے۔ یہ حشو و زوائد اور متروک الفاظ سے
پاک ہیں۔ زبان کی گھلاوٹ۔ روزمرہ کی صفائی۔ قافیوں کی نشست اور
مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے ان مثنویوں کو "بدر منیر" پر فضیلت حاصل
ہے۔ ان میں مردانہ اور زنانہ محاوروں کو اس طرح استعمال کیا گیا ہے
کہ نثر میں بھی اس بے تکلفی سے برتنا مشکل ہے۔

مرزا شوق کے بعد متاخرین میں منیر شکوہ آبادی محسن کاکوروی اور مرزا محمد حسین
ہوش نے اچھی مثنویاں لکھی ہیں جو سراسر متقدمین کے تتبع میں ہیں۔

البتہ اس دور میں شوق قدوائی کا وجود ایسا تھا جن کو ہم
مثنوی نگاروں کی صف میں کھڑا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کئی مثنویاں
اردو میں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک "ترانہ شوق" ہے جو گلزار نسیم
کے رنگ میں لکھی گئی ہے اور دوسری "عالم خیال" جو ان کی مثنویوں
میں ماسٹر پیس ہے اور اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جاسکتی
ہے۔ اس میں عورت کے جذبات کو نہایت خوبی سے ادا کیا
گیا ہے اور پھر یہ التزام کہ فارسی اضافت نام کو بھی نہیں پائی جاتی
ان دو کے علاوہ اور بھی کئی مثنویاں انہوں نے لکھی ہیں لیکن وہ اس پایہ
کی نہیں کہ ان کا یہاں ذکر کیا جاسکے۔

شوق قدوائی کے بعد کوئی قابل ذکر مثنوی نگار اردو دنیا اب تک نہ پیدا کر سکی۔

مثنویات

(۱)

صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید — اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
پہنچی نصف النہار دریا پر — روئی بے اختیار دریا پر
حد سے افزوں جو بیقرار ہوئی — دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ — یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش — تھا تلاطم سے کس طرح ہمدوش
تجھ کو آیا نظر کہاں آ کر — پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جا کر
مجھ کو دیجو نشان اس جا کا — میں بھی دیکھوں خروش دریا کا
ہوں میں نا آشنائے سیرِ آب — ناشناسائے موجۂ گرداب
لجہ کیا۔ لطمہ کس کو کہتے ہیں — گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں
ہیں میسر کہاں یہ سیر عبور — اتفاقی ہیں اس طرح کے امور
مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل — لیک تہ سے سخن کے تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریبِ عشق — ہے یہ مہ پارہ ناشکیبِ عشق
بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف — یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف

یاں وہ بیٹھا حباب کے مانند
پھر نہ تھا کچھ سراب کے مانند

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر — گر پڑی قصدِ ترکِ جاں کر کر
موج ہر یک کمندِ شوق تھی آہ — لپٹی اس کو برنگِ مارِ سیاہ
دام گستردہ عشق تھا تہِ آب — جس کے حلقے تمام تھے گرداب
حسن موجوں میں یوں نظر آوتے[۱] — نورِ مہتاب جیسے لہراوتے[۲]
تھی نہ وہ اس کی حنائی انگشتاں — غیرت افزائے پنجۂ مرجاں

۱و۲ = آوتے اور لہراوتے آجکل متروک ہیں اسکے بجائے آئے لہرائے بولتے ہیں۔

سر پہ جس دم کہ آب ہو کے بہا — سطحِ پانی کا آئینہ سا رہا
کششِ عشق آخر اس مہ کو — لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو
باہم آغوش مردہ یار ہوئے — تہ میں دریا کے ہمکنار ہوئے
پاک کی زندگی ز آلائش — ہو گئے دست و بغل کی آسائش
سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ — آفت اک لے گئی نئی دایہ
اب و عم مادر و برادر سب — خاک افشان و آہ و نالہ بلب
سوئے دریا رواں ہوئے گریاں — آتشِ غم سے دل جگر بریاں
خلق یکجا ہوئی کنارے پر — حشر برپا ہوا کنارے پر
دام داروں سے سب نے کام لیا — آخر ان کو اسیرِ دام کیا
نکلے باہر و لے موئے[1] نکلے — دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا — مر گئے پر بھی شوق پیدا تھا
جو نظر ان کو آن[2] کرتے تھے — ایک قالب گمان کرتے تھے
کیا لکھوں مل رہے تھے وصلی وار — ہمدگر سے جدا ہوئے دشوار
کیوں نہ دشوار ہوئے انکا فصل — جان دیدے ہوا ہو جن کا وصل

حیرتِ کارِ عشق سے مردم
شکل تصویر آپ میں تھے گم

میر

---

(۲)

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ — ہوا رشک سے جسکے لالہ کو داغ
عمارت میں خوبی دروں کی وہ شان — لگے جس میں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار — دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا — کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا

---

[1] موئے کے بجائے اب مرے ہوئے بولتے ہیں ۔
[2] آن کے بجائے اب آکر بولتے ہیں ۔

وہ مقیش کی ڈوریاں سربسر
کہ مہ کا بندھا جس سے تارِ نظر

چھٹوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال
نگہ کو وہاں سے گزرنا محال

سُنہری مغرق چھتیں ساریاں[1]
وہ دیوار اور در کی گُل کاریاں

دئے ہر طرف آئینے جو لگا
گیا چوگنا لُطف اُس میں سما

وہ مخمل کا فرش ایسا ستھرا کہ بس
بڑھے جسکے آگے نہ پائے ہوس

رہیں کھلتے اس میں روشن مدام
معطر شب و روز جس سے مشام

چھپرکھٹ مرصع وہ دالان میں
چمکتا دمکتا تھا ہر آن میں

زمیں پر تھی اس طور اس کی جھلک
ستاروں کی جیسے فلک پر چمک

زمیں کا کروں اس کی کیا میں بیاں
کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں

بنی سنگِ مرمر کی چوپڑ کی نہر
گئی چار سو اس کے پانی کی لہر

کھڑے تھے قرینے سے سرو سہی
ذرا دور دور اُن سے سیب و بہی

کہوں کیا میں کیفیتِ دار بست
لگائے رہیں تاک واں مے پرست

ہوائے بہاری سے گل لہلہے
چمن سارے شاداب اور ڈہڈہے

زمرّد کی مانند سبزہ کا رنگ
روش پر جواہر لگا جیسے سنگ

روش کی صفائی پہ بے اختیار
گُلِ اشرفی نے کیا زر نثار

چمن سے بھرا باغ گل سے چمن
کہیں نرگس و گُل کہیں یاسمن

چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا
کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا

کھڑے شاخ شبّو کے ہر جا نشان
مدن بان کی آ و رہی آن بان

کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار
جُدی[2] اپنے موسم میں سب کی بہار

کہیں جعفری اور گیندا کہیں
سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں

عجب چاندنی میں گلوں کی بہار
کہ ہر اک سفیدی سے مہتاب وار

کھڑے سرو کی طرح چنپا کے جھاڑ
کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ

کہیں زرد نسریں کہیں نسترن
عجب رنگ کے زعفرانی چمن

پڑا آبِ جو ہر طرف کو بہے
کریں قمریاں سرو پر چہچہے

[1] اب ایسی جمعیں متروک ہیں، اسکے بجائے واحد "ساری" بولتے ہیں ۔ [2] جدا اب لو

گلوں کا لب نہر پر جھومنا
اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشے کا سا عالم گلستان پر

لئے ہاتھ میں بیلچے مالنیں
چمن کو لگیں دیکھنے بھالنے

کہیں تخم پاشی کریں گود کر
پنیری جماویں کہیں کھود کر

کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
رہیں ہاتھ جوڑے مست گردن میں ڈال

لب جُو پہ آئینے میں دیکھ قد
اکڑنا کھڑے سرو کا حد نہ تد

خراماں صبا صحن میں چار سُو
دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بُو

کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے
لئے ساتھ مرغابیوں کے پرے

صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور
درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور

چمن آتش گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے پھول
پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھاؤں
لگی جائیں آنکھیں لئے جن کا ناؤں

خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں
تعشق سے آپس میں باتیں کریں

درختوں نے برگوں کے کھولے ورق
کریں طوطیاں بوستاں کا سبق

سماں قمریاں دیکھ اس آن کا
پڑھیں باب پنجم گلستان کا

میر حسن

۳

گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا
اور غنچہ صبح کھلکھلایا

وہ سبزۂ باغ خواب آرام
یعنی وہ بکاؤلی گل اندام

۱؎ اس کے بجائے آجکل جمائیں بولتے ہیں ؞

۲؎ یہ لفظ اب متروک ہے۔ انکے بجائے مشل وغیرہ بولتے ہیں ؞

۳؎ متروک۔ جب بولتے ہیں ؞

۴؎ متروک ہے نام بولتے ہیں ؞

جاگی مرغِ سحر کے غل سے
اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پُر آب وہ چشمِ حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گُل کِھلا ہُوا ہے

گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بُو ہو گئے تو گُل اُڑا نہیں ہے

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گُل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پُتلی وہی چشمِ حوض کا تھا

گُلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
غنچہ کے بھی مُنہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

او بادِ صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سُنگھا پتا نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے
گل تو ہی مہک سنگھا کدھر ہے

لرزاں تھی زبس یہ دیکھ کُہرام
تھی سبزہ سی راست مو براندام

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اس کا غرض لگا بدلنے
گل برگ سے کف لگی وہ ملنے

گل کا سا لہو بھرا گریباں
سبزہ کا سا تار تار داماں

دکھلا کے کہا سمن پری کو
اب چین کہاں بکاؤلی کو

تھی بسکہ غبار سے بھری وہ
آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ

ہر باغ میں پھولتی پھری وہ
ہر شاخ میں جھولتی پھری وہ

جس تختہ میں مثلِ باد جاتی
اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
پتا کہیں حکم بن ہلا ہے

نسیم

(۴)

ایک قصبائے ہند میں ہے دیار — واں ہوا حسب اتفاق گذار
شہر دیکھا کہ آدمی تو کیا — گر پری دیکھ لے تو ہو سکتا
واقعی ہے طلسم کا وہ دیار — سحر آگین ہیں کوچہ و بازار
طرفہ جوبن عجیب عالم ہے — جتنی تعریف کیجئے کم ہے
حُسن میں ایک ایک ماہ جبیں — غیرت لعبتان لندن و چین
کوئی بازار میں ہر آفت ہوش — دل خریدار و ناز و غمزہ فروش
دیکھو جس جا دکان حُسن ہے باز — جنس ہے ناز و شوخی و انداز
ہر طرف شعلہ رُو سمن اندام — شکل طاؤس کبک گرم خرام
واں تو بیکار ہے آسماں کا دَور — گردشِ چشم مہوشاں کا ہے دَور
جو کہ محمل نشین ہے لیلیٰ ہے — ایک معمورۂ تجلّی ہے
حاجت مہر و ماہ نہیں واں ہے — رات دن نور حُسن تاباں ہے
صورت آسماں ہے اُسکی زمین — سنگریزے ہیں غیرت پروین
یُوسفستان ہے وہ نواح دیار — کوچہ کوچہ ہے مصر کا بازار
رودکش خلد ہے ہر ایک دکان — ہیں دکاندار غیرتِ غلمان
مشتری کا ہجوم ہے ہر سُو — خود فروشی کی دھوم ہے ہر سُو
جنس ہوش و خرد گراں واں ہے — ایک سودا جنوں کا ارزاں ہے
سرد مہری کے دل جلے ہیں فگار — ٹھنڈی سانسوں کا گرم ہے بازار
ہر جگر سوختہ جدھر جائے — سکۂ داغِ دل بھُنا لائے
ہے جو ایک ایک طبلۂ عطار — اُن میں ہے داروئے دل بیمار
پھول والے گلے کے ہوتے ہیں ہار — کوچہ کوچہ ہے کوچۂ گلیار
ہے ہر اک گل فروش البیلا — پھول والوں کا روز ہے میلا
کیا کھری صورتیں ہیں صرّاف — دلبری کے چلن ہیں ہیں حرّاف
کس غضب کی نگاہ رکھتے ہیں — خوب کھوٹا کھرا پرکھتے ہیں
پائمالی کے سب ہیں یاد چلن — دل کو ملتے ہیں جب پرکھتے ہیں گہن

ایسا کانٹا ہے خار مژگان کا
وزن کم بکتا ہے زر جان کا

ہیں طرحدار کتنے میوہ فروش
پستۂ لب پہ ہے یہ ان کے خروش

جان دیں لے کے نشاہان چمن
بیچ ڈالے ہیں سستے سیب زقن

رشک لیلیٰ ہے ایک اک کنجڑن
جنس کے بدلے بکتا ہے جوبن

ہیں یہ سودے پہ مشتری مفتوں
مول لیتے ہیں صورت مجنون

دلفریب ان کے ہیں غضب جوبن
ناشپاتی ہیں سب کے سیب ذقن

بانکی بانکی ادا غضب باتیں
وہ اکڑ وہ تنی تنی گاتیں

آنکھ میں سحر کی لگاوٹ ہے
بات میں قہر کی بناوٹ ہے

جب کہیں بیچنے نکلتے ہیں
دل کو تلووں سے ملتے چلتے ہیں

سب کو بن جو کھے چیز دیتے ہیں
ہم تو نظروں میں تول لیتے ہیں

بنگ نوشوں کی اک طرف ہے بہار
سافنوں کی دکانیں ہیں گلزار

شام سے صبح صبح سے تا شام
نشے بازوں کا جھمگٹا ہے مدام

دائرہ اور چکارہ بجتا ہے
بے سُری ایک اکا دُکا پچتا ہے

کتنے ہیں سافنوں سے ساغر نوش
ہم کو بھی کر دے جان من مدہوش

دیدوا دید ادھر بھی ہو جائے
ہم نمک بھی یہ جام ہو جائے

گہ بگڑتی ہے گاہ بنتی ہے
بنگ نوشوں میں گاڑھی چھنتی ہے

سافنیں حقے جب پلاتی ہیں
عاشقوں کے دھوئیں اڑاتی ہیں

نشہ باز ایک دم لگاتا ہے
ایک مخمور غل مچاتا ہے

بی بی ساقن کے دم کی خیر رہے
ہمیں محسر دم دم بغیر رہے

ایک جانب کھلا ہے بزازا
اُن دکانوں میں رہتے ہیں کیا کیا

کسی بزاز سے کہیں ہے یہ حال
دو گھڑی تک جھگڑتے ہیں دلال

سیٹھ جی اتنے آڑے ترچھے نہ ہو
واجبی نین سکھ کا مول کرو

چھبتی دینا دلائے گر بھگوان
نفع بھر کھاتے نہیں ہے کیا نقصان

کہیں گاہک سے کہہ رہا ہے کوئی
مشتری آپ سے سوا ہے کوئی

پیر و مرشد کی جیسی مرضی ہو
آپ کے ہاتھ کی ہی بوہنی ہو

کتنے شیریں ادا ہیں حلوائی — مثل شیرین ہے اُن میں رعنائی
چاشنی گیر عشق خود بھی ہیں — باتیں قند مکرر اُن کی ہیں
شیرۂ جان کی وہ مٹھائی ہے — جس نے کھائی ہے جان آئی ہے
وہ شکر پارے ایسے ہیں شیریں — چاٹ لے ہونٹ کھائے گر شیریں
جس جگہ کیجیئے صفت اُس کی — نقل محفل ہو وصف شیرینی
ہر دکان رشک خوان نعمت ہے — جان سرمایۂ حلاوت ہے
نہال ہیں مہر و مہ سے روشن تر — رشک نار شعاع مہر جنور
کس قدر خوشگوار حلوا ہے — صاف لذت میں من وسلوا ہے
دل عاشق ہے ایک ایک جرس — ہے وہ زنجیر رشک تار نفس
غل مچاتے ہیں خوانچے والے — دیکھ پچھتائیگا نہیں کھائے
ذی حلاوت بہت کرارا ہے — من چلوں کے لئے بنایا ہے
نوجوان نوجوان پری سقّے — آبرو ریز و دلبری سقے
وہ مصفا سڑک وہ ان کا جماؤ — آب گوہر کا چار سو چھڑکاؤ
رات دن جمگھٹا ہے میلہ ہے — مہر و مہ کا کٹورا بجتا ہے
ہے وہ خطہ جواب ہفت اقلیم — الغرض انتخاب ہفت اقلیم

"قلق"

---

(۵)

رنج کرنا نہ میرا۔ میں قربان — سُن لو گر اپنی جان ہے تو جہاں
دل میں کڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تو — جان دینا نہ گھونٹ گھونٹ کے تو
آکے رو لینا میری قبر کے پاس — تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا — قبر میری گلے لگا لینا
اگر آجائے کچھ طبیعت پر — پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا — پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
روکے کرنا نہ اپنا حال زبوں — یوں نہ ہو جائے دشمنوں کو جنوں

میرے مرقد پہ روز آنا تم | فاتحہ سے نہ ہاتھ اُٹھانا تم
ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے | مٹّی دینا تم اپنے ہاتھوں سے
دل پہ کچھ آنے دیجیو نہ ملال | خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
رنج و راحت جہاں میں توام ہے | کبھی شادی ہے اور کبھی غم ہے
ہے کسی جا پہ جشن شام و پگاہ | کسی جا ہے صدائے نالۂ و آہ
مرگ کا کس کو انتظار نہیں | زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
پھر مُلاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو | آج دل کھول کے گلے مِل لو
حشر تک پھر یہ ہوگی بات کہاں | ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں
خاک میں ملتی ہے یہ صورتِ عیش | پھر کہاں ہم۔ کہاں یہ صورتِ عیش
ختم ہوتی ہے زندگانی آج | خاک میں ملتی ہے جوانی آج

چین دل کو نہ آئے گا تم بن
اب کے بچھڑے ملینگے حشر کے دن

آگے آگے ہے کچھ جلوس رواں | سر کھلے پیچھے پیچھے پیر و جواں
سن رسیدہ ہیں عورتیں کچھ ساتھ | سینہ و سر پہ مارتی ہیں ہاتھ
کوئی ماما ہے کوئی دائی ہے | کوئی آنا کوئی کھلائی ہے
جب وہ بھرتی ہیں غم سے آہِ سرد | سُننے والوں کے دل میں ہوتا ہے درد
ہوتا ہے غیروں کو ملال ان کا | دیکھا جاتا نہیں ہے حال اُن کا
اسکے پیچھے پڑی پھر اس پہ نگاہ | کہ نہ دیکھے بشر معاذ اللہ
تھی پڑی اس پہ ایک چادرِ گُل | جس سے خوشبو وہ راہ تھی بالکل
بھیڑ تابوت کے تھی ایسی ساتھ؎ | جیسے آئے کسی دُلہن کی برات
سب وضیع و شریف تھے ہمراہ | بھیڑ تھی اس قدر کہ بند تھی راہ
پیچھے پیچھے تھا سب کے سوداگر | مو پریشاں اُداس خاک بسر
آگے آگے جنازہ جاتا تھا | غش اسے ہر قدم پہ آتا تھا

؎ اب ساتھ اور برات کا قافیہ کرنا متروک ہے۔

ہاتھ تھامے تھے اقربا سارے · تا کسی جا پہ سر نہ دے مارے
حال اس درجہ ہو رہا تھا زبوں · بہتا جاتا تھا سر کے زخم سے خوں
سب امیر و فقیر روتے تھے · دیکھ کر راہ گیر روتے تھے
پیچھے سب کے فینس میں تھی مادر · کہتی جاتی تھی اس طرح رو کر
تیری میت پہ ہو گئی میں نثار · کم سخن ہائے میری غیرت دار
کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو · کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو
دل پہ جو گزری کچھ بیان نہ کی · کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی
دل ضعیفی میں میرا توڑ گئی · بیٹا اس ماں کو کس پہ چھوڑ گئی
تازہ پیدا جگر کا داغ ہوا · گھر مرا آج بے چراغ ہوا
دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے · جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
زہر دیدو کوئی میں کھا جاؤں · یا زمیں شق ہو میں سما جاؤں
داغ تیرا! جگر جلاتا ہے · چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے
مٹ گیا لطف زندگانی کا · دل کو غم ہے تری جوانی کا
بیاہ تیرا رچانے پائی نہیں · کوئی منت بڑھانے پائی نہیں
تیری صورت کے ہو گئی قرباں · چلیں دنیا سے کیسی پر ارماں
ہوئیں کس بات پر خفا بولو · اماں، واری ذرا جواب تو دو
بولتی تم نہیں پکارے سے · اب جیوں گی میں کس سہارے سے
کیا قضا نے جگر پہ داغ دیا · آج گھر میرا بے چراغ کیا
نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارماں · ہائے بیٹی نہ تم چڑھیں پرواں
ایسی اس ماں سے ہو گئیں بیزار · لی نہ خدمت بھی پڑ کے کچھ بیمار
نہ جیوں گی ترے فراق میں میں · دل تڑپتا ہے آنکھیں ڈھونڈتی ہیں
کس مصیبت میں پڑ گئی بیٹا · کوکھ میری اجڑ گئی بیٹا

عمر کتنی تھی ایسے صدمے میں
ٹھوکریں تھیں بدی بڑھاپے میں

مرزا شوق

(٦)

یہ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہوا — تڑپنے لگا دل اُچھلنے لگا
زمیں تک مرے آنسو آنے لگے — فلک تک مرے نالے جانے لگے
جگر میں تپش لب پہ شیون ہے کیوں — مجھے آپ ہی آپ الجھن ہے کیوں
مری چشمِ تر کا یہ کیا حال ہے — کہ دامن سے تا آستین لال ہے
مرا رنگ فق ہوتا جاتا ہے کیوں — بدن خود بخود سنسناتا ہے کیوں
سبب کیا کہ میں سر کو دُھننے لگا — ہوا کیا کہ میں تنکے چننے لگا
ہنسی میں مرے آنسو بہنے لگے — مجھے لوگ سودائی کہنے لگے
نیا راگ لائی مری بے کسی — چھُٹا دل میں جنگل کی دھن ہو گئی
مرے منہ پہ زردی سی کیوں چھا گئی — چمن میں مرے کیوں خزاں آ گئی
پسینے بھی دیکھے نکلتے ہوئے — ہے گھبراہٹ اتنی مجھے کس لئے
گھڑی اپنے ہاتھوں اُٹھانے چلا — کھُلے بند میں قید خانے چلا
چمن سے مجھے شوقِ صحرا ہوا — نئے رنگ کا مجھ کو سودا ہوا
خزاں آئے تو دل کو کھٹکا نہیں — بہار آئے تو مجھ کو پروا نہیں
طبیب آئیں بالیں پہ تو دم گھٹیں — مری نبض دیکھیں تو نبضیں چھٹیں
کوئی فصد لے یاں اثر تک نہ ہو — کوئی پچھنے دے یاں خبر تک نہ ہو
عجب طرح کا ہے یہ دیوانہ پن — نہ شوقِ خموشی نہ ذوقِ سخن
اگر بے محل گفتگو کی ٹھنی — بلا نطق کو خلعتِ سوسنی
خموشی ہوئی گر بجائے سخن — بلا نالہ کو سرمئی پیرہن
جو سوتے میں شب کو رہی بیکلی — تو خوابِ پریشاں سے نیند اڑ گئی
جو دن کو یہی سوزِ باطن رہا — تو دن بھر مرا کیا بُرا دن رہا
خوش آتی نہیں اب مجھے کوئی شے — نہ دریا نہ گلشن نہ مینا نہ مے
نہیں کوئی سامان مجھے سازدار — نہ ساقی نہ مطرب نہ فصلِ بہار
کبھی میری کیفیت ایسی نہ تھی — یہ شورش یہ سوزش یہ گرمی نہ تھی
نہ ایسی کبھی بے قراری ہوئی — نہ مجھ پر غشی ایسی طاری ہوئی

نہ آنکھوں کے پردے گلابی ہوئے
نہ تارِ آنسوؤں کے شہابی ہوئے

گھڑی بھر میں ہی ہوگیا گرد برد
ستم ہے غضب ہے کلیجے کا درد

نہ کیا کیا ہوس زندگانی کی تھی
مگر موت آنی جوانی کی تھی

کوئی دم میں دم ہی نکلتا ہے آج
کلیجا مرا کوئی ملتا ہے آج

چلی آتی ہیں ہچکیاں دم بدم
مجھے یاد کرتے ہیں اہلِ عدم

اندھیرا مری آنکھوں میں چھا گیا
جبین پر تو دیکھو عرق آ گیا

تڑپنے مجھے دو نہ بولو خدا
مرے ہاتھ اور پاؤں کھولو ذرا

نہ لِلّٰہ مجھ کو سنبھالے کوئی
مرے مُنہ میں پانی نہ ڈالے کوئی

سبکروحی یاروں کو دکھلاوں میں
کہ بو ہو کے غنچہ سے اڑ جاؤں میں

میں کس واسطے خاطر آزار ہوں
کسی کے دل و دوش کا بار ہوں

ہو آنکھوں سے آب رواں موجزن
اُسی میں نہاؤں وہی ہو کفن

مرے فاتحہ کو نہ آئے کوئی
جنازہ نہ میرا اٹھائے کوئی

نہ قل ہو نہ پھول اور نہ میلہ رہے
مرا مردہ سب سے اکیلا رہے

نہ شمع لحد کا بھی آنسو بہے
فقط بے کسی مجھ کو روتی رہے

خفا کر کے محسن نہ پھیریں مجھے
فرشتوں سے کہدو نہ گھیریں مجھے

سمجھنا نہیں میں حساب و کتاب
یہ رکھتا ہوں اک مختصر سا جواب

نہ میں نے کیا کچھ نہ جانا کبھی
مگر سجدۂ آستانِ نبیؐ

خطا بخش بدبو آنگہ کبریا
حبیبِ خدا اشرفِ انبیا

زاسمائے او روزِ اُمید و بیم
شفیعِ ۱، مُطاعِ ۲، نبیِ ۳، کریم

"محسن کاکوروی"

---

(۷)

نظر آیا وہاں اک بحرِ موّاج
صفا میں حس کا پانی لوحِ عاج

حباب اک اک سپہرِ عالمِ نور
چراغِ ماہ و مہرِ عالمِ نور

جو مُنہ تکے شیشوں کی ہل جائے عینک
کتاب عمر پڑھ تو خاتمہ تک

جو اُن کے خیموں میں پائے رسائی
تو چھو لے سقفِ عرشِ کبریائی

حباب ایک ایک تھا اس درجہ پُر نور
کہ جن میں دیکھ لو اسرارِ مستور

وہاں پانی بھرے نہرِ آبرو کی
نظر آنے لگے نیت وضو کی

جو اُن برجوں کا سایہ پاؤں پھیلائے
شکستوں کی مرمت خوب ہو جائے

اگر اس برجِ آبی کا کھلے در
تو نکلے اخترِ تقدیرِ کوثر

کوئی شاعر اگر بر عکسِ تنزیہ
ہما کے بیضہ کو دے ان سے تشبیہ

تو زردی ہو ندِ خورشیدِ رفعت
سفیدی نقرۂ صبحِ سعادت

بہم گردوں سے سکو ہمسری عار
نہ بدلے مہر و مہ سے کوئی دستار

جو آجائیں میانِ شیشہ و سنگ
شکست ان کو نہ ٹھہرے لکھ فرسنگ

جو رکھ دو ان کے شیشہ کو گھڑے پر
تو رقصِ زہرہ ہو ساعت کا چکر

وہ دریا تھا کہ قدرت کا مرقّع
ہر اک موج اس کی زنجیرِ مرصّع

خرامِ موج پر نظارہ بیخود
دمِ عیسیٰ کی جیسے آمد و شد

نہ سُست اپنے چلن میں نہ چابک
رواں جس طرح نبضِ دستِ نازک

کروں کیا پیچ و خم کا اُنکے مذکور
شکن بیجائے جس سے گیسوئے حور

خطوطِ قسمتِ پاکیزہ دیں نہیں
سطورِ مصحفِ ماءِ معین نہیں

اگر موجِ حصیر ان کی چلے چال
بنے چینِ جبینِ اہلِ اقبال

دماغِ بوریا بھی ہو معلّٰے
بچھا دے آبِ کوثر پہ مصلّٰے

کہوں کیا خوبیٔ خطِ شکستہ
درستی جن کی خادم دست بستہ

اگر ہوں زلزلہ سے کوہ بیتاب
نہ ٹلنے پائے ہرگز نافِ گرداب

بھنور ہم جلوہ مہرِ مبین تھی
بغل پروردۂ نافِ زمین تھی

یہ نکتے اونکی گردش سے عیاں ہیں
حسامِ موج کو سنگِ فسان ہیں

چہِ کنعان سے بڑھ کر جلوہ گر ماند
نظر آتے تھے ہر ہالہ میں سو چاند

کفِ دریا کفِ موسیٰ کی مانند
مصفّا تر ید بیضا کی مانند

برنگِ مغزِ جانِ قدسیاں نرم
مثالِ پنبۂ صبحِ جناں نرم

صفائے رنگ یکساں ان میں خوشبو
کھلے تھے موگرے کے پھول ہر سو

حلاوت کے لب دریا ہیں آثار — چپکتی تھی زبانِ موج ہر بار
دہانِ شوق بوسہ اس کا بیکر — بھلاوے لذتِ قندِ مکرر
وصالِ یار سے بجز نا نہ تھا دل — کھلی تھی شوق ہیں آغوشِ ساحل
نزاکت کو جو ہو بوسہ کا آہنگ — لبِ دریا ہوں نیلوفر سے ہم رنگ
زبس ہے خندۂ شادی سی مطلب — جدا ہے ایک لب سے دوسرا لب
کتابِ عمرہ تھا وہ بحرِ مقصود — مگر آغاز و انجام اُس کا مفقود
نمایاں مچھلیاں خوش قطع ہر سُو — جبینِ صاف پر جس طرح ابرُو
حرام اُن سے ہوئی تشبیہ اس کی — کہ بے چھلکے کی ہے سکہ کی مچھلی
چمک فلسوں کی اُن کے زیرِ دریا — چراغانِ آئینہ خانہ ہیں گویا
ضیا ہیں اُنکی آنکھوں کے مقابل — ہوئی چشم کواکب نقشِ باطل
جو دیکھے مچھلیوں کے سینکڑوں رنگ — تو لوحِ سادہ ٹھہرے نقشِ ارژنگ
جو ہو اُسکے نہنگوں سی خبر یاب — تو طنبینِ فلک کا زہرہ ہو آب
جو اُن کی پشت کا ہو تیز آرہ — نکل جائے چنارِ عمر کا غرہ
فلک پر فلکِ اعلیٰ سے تھی ہل چل — سُمِ گاوِ زمین تھا فکّ اسفل
صدفِ مثلِ دہانِ یارِ خندان — دکھاتے تھے درِ شہوار دندان
ہوا جب پنجۂ مرجان حنائی — غضب کی آگ پانی ہیں لگائی
محیطِ چرخ و آبِ زندگانی — اسی کے گھاٹ کا پیتے تھے پانی
فزونِ تر آئینہ سے جلوہ گر تھا — مکدر اُس سے رنگِ سیم و زر تھا
اگر غوطہ لگائے اس میں دم بھر — تو عجلِ سامری ہو گا و عنبر

منیر شکوہ آبادی

---

(۸)

بیٹی کو لئے سپہر آرا — پہنچی اُس باغ ہیں قضا را
باہر ٹھہرے وزیر عاقل — گلشن میں ہوئی بہار داخل
شادی کے بھی میہمان آئے — دکھلانے کو اپنی شان آئے

ہنس کر ملکہ کو یوں سنایا بی بی حق نے یہ دن دکھایا
دن گنتے اتنی عمر گذری بارے قسمت نے یاوری کی
ہو جشن یہ آپ کو مبارک بولی تم کو بھی ہو مبارک
باتیں یہ کر رہے تھے مہمان ہنس ہنس کے وہ کہہ رہی تھی ہاں ہاں
گھما گھمی تھی باغ بھر میں شادی کی چہل پہل تھی گھر میں
شہنا نقارے بج رہے تھے گھر کو فراش سج رہے تھے
جوڑے جو بٹے تھے زرد زرتار اندر باہر تھا زعفران زار
سامان جو سب درست پایا لڑکی کو مائیوں بٹھایا
تیار ہوئیں جو سمدھنیں سب ڈیوڑھی میں سواریاں لگیں تب
آگے تھا نشان کا فیل میمون ڈنکے کی وہ دمبدم گرج دھوں
باجے تھے طرح طرح کے بجتے نقارے تھے دمبدم گرجتے
پہنے تھے سب جو وردیاں زرد تھا رنگ زمین و آسمان زرد
گنتی میں بیشمار تھے خوان اُبٹنے کے کئی ہزار تھے خوان
چوکی جو جواہرات کی تھی ہم پایۂ تخت خسروی تھی
بعد اس کے کشتیاں کئی سو کشتی پوشوں میں مہر کی ضو
دستور عقیل مرکبوں پر ہر سمت نگہ ہنسی لبوں پر
اسباب تزک جلوس شاہی صف بستہ سیکڑوں سپاہی
بعد اس کے سواریاں زنانی شہزادی تھی کوئی کوئی رانی
ہوتا ہوا گنج گنج انعام جا پہونچے شہر میں سر شام
کچھ کشتیاں ساتھ لے کے اکبار اُتریں سب سمدھنیں طرحدار
ہنستی کوئی کوئی کھلکھلاتی ٹکھیال میں کوئی لوٹی جاتی
ایک ایک سے کرتی تھی اشارا تم آگے چلو بہن خدارا
اک ناز سے شرم کھائے اُتری اک پائچوں کو اٹھائے اُتری
یاں بھی پریوں کا تھا اکھاڑا تیار کھڑا تھا سارا دھاڑا
ڈالا جس کے گلے میں اک ہار ساتھی اُسکے چھڑی بھی دی مار

چلنے لگی چوٹ ہمسنوں میں ‌ ‌ ‌ تھی دھوم زیادہ کمسنوں میں
گستردہ زمین پہ فرش گل تھا ‌ ‌ ‌ اُف اُف کا نازکوں میں غل تھا
جب سنتے ہیں تا بہ فرش پہنچیں ‌ ‌ ‌ دونی ہوئی مسندوں کی زینیں
تھیں ڈومنیاں وہاں بھی تیار ‌ ‌ ‌ پڑنے لگی گالیوں کی بوچھار
ہنس ہنس کے بجائیں تالیاں خوب ‌ ‌ ‌ کھائیں ان سب نے گالیاں خوب
اس رسم کے بعد پھر بصد جاہ ‌ ‌ ‌ بلوایا گیا محل میں نوشاہ
جوڑا مانجھے کا زعفرانی ‌ ‌ ‌ رنگ عاشق کی تھا نشانی
کنگنا جو بندھا کھلا یہ اسرار ‌ ‌ ‌ ہاتھ آگیا نجم بخت بیدار
بٹنا وہ لگا دیا سر دست ‌ ‌ ‌ خوشبو نے جس کی کر دیا مست
پینڈی ڈھکا کے جب کھلائی ‌ ‌ ‌ نوبت بے باکیوں کی آئی
کھینچا جب ہاتھ سالیوں نے ‌ ‌ ‌ تب ہنس دیا ہنسنے والیوں نے
کچھ چھین جھپٹ کے پینڈی کھائی ‌ ‌ ‌ جب کچھ نہ ملا تو شرم آئی
رشتے میں اس کے تھی کوئی ساس ‌ ‌ ‌ کچھ بڑھ کے وہ آ کھڑی ہوئی پاس
دولھا سے جب کیا اشارا ‌ ‌ ‌ سمجھا تو ہنسا وہ ماہ پارا
ہاتھ اک کا پکڑ لیا قمر نے ‌ ‌ ‌ وہ سب بگڑیں دوئی دوئی کرنے
ہاتھ اس کا چھڑا کے پھر یہ بولیں ‌ ‌ ‌ تیوری کو چڑھا کے پھر یہ بولیں
کرتے ہیں سب سے شرم دولھا ‌ ‌ ‌ ہوتے نہیں گرما گرم دولھا
بولا وہ غضب کا ہنسنے والا ‌ ‌ ‌ ٹھنڈوں سے تمہیں پڑا ہے پالا
خیر اب جلدی سے پان کھلواؤ ‌ ‌ ‌ یہ پینڈیاں سب بچا کے لیجاؤ
اک سالی یہ بولی مسکرا کے ‌ ‌ ‌ کڑوے ہونا نہ پان کھا کے
وہ بولا اگر نہ پان دوگی ‌ ‌ ‌ صحبت میں سرخرو نہ ہوگی
ہنس ہنس کے یہ کلام کر کے ‌ ‌ ‌ اُٹھا سب کو سلام کر کے
خسرو جس جا تھا محفل آرا ‌ ‌ ‌ ہنستا ہوا وہ ادھر سدھارا
جو جو تھا مانجھا لے کے آیا ‌ ‌ ‌ خاصہ سب نے انہیں کھلایا
کیں سب کو کشتیاں حوالے ‌ ‌ ‌ گوٹے کے گلے میں ہار ڈالے

آئی جس وقت دوپہر رات
اسوار ہوئی ہر اک خوش ذات

کس حسن سے پھر کے سب اسی طور
پہنچے منزل میں اپنی فی الفور

یاں بزم کا رنگ طرفہ تر تھا
دولہا مسند پہ جلوہ گر تھا

حلقے میں لئے ہوئے اسے شاہ
تارے تھے گرد بیچ میں ماہ

گانے کا سماں بندھا ہوا تھا
اک اک سرمست ہو رہا تھا

نغمے میں جو حق نے دی ہے تاثیر
ہر قلب پہ پڑ رہا تھا اک تیر

وقت آ گیا بھیرویں کا جس دم
کچھ اور ہی تھا سبھا کا عالم

لے کیسی خیال کب تھا آ سکا
باقی تھا نہ ہوش دست و پا کا

ناگہ نوبت اذان کی آئی
اور وردی صبح کی بجائی

وصبان آ گیا طاعت خدا کا
وقت آ گیا فرض کی ادا کا

برخاست ہوئی غرض وہ صحبت
مسجد میں ہوئی بڑی جماعت

دن بھر رہا جشن عیش و آرام
آ پہنچا عصر کا جو ہنگام

سانچق ہوئی یاں سے بھی روانہ
شاہی سارا تھا کارخانہ

چاندی کے ہزاروں جو گھڑے تھے
سونے کے آٹھ سو گھڑے تھے

مٹکے صد رقچے طلا کار
چھکڑوں پہ نقل و فرض کے بار

ان سب سے کشتیاں علاوا
تھا جن میں دلھن کا سب چڑھاوا

بجتے ہوے سب نئے نئے ساز
گاتے ہوئے مطرب خوش آواز

اک ہاتھی پہ زیر چتر نوشاہ
حلقہ کیے چار پانچ سو شاہ

جوڑے خوشرنگ سب کے وہ زرد
نکھرے ہوئے سب کے سب زن و مرد

پہنے ہوئے وردیاں سپاہی
لٹتا ہوا گنج بادشاہی

اس باغ میں گلعذار پہنچے
جنت میں امیدوار پہنچے

دولہا کو محل میں جب بلایا
دیکھا جس نے یہی سنایا

بھولا بنّو کا یہ بنا ہے
دولھا لاڈو کا لاڈلا ہے

القصہ چڑھا کے سب چڑھاوا
سب لے گیا اپنے گھر کا دھاوا

گزرے شب و روز چہچوں میں
چہلوں میں ہنسی میں قہقہوں میں

جبر سے گلوں کا اڑ گیا رنگ — مہندی جانے کا جب بندھا رنگ
دن کر دیا روشنی سے شب کو — جوڑے، دیئے لال لال سب کو
سونے کے طباق کچھ منگائے — چوبے وہ ملیدے کے بنائے
وہ عمدہ جڑاو چوکی و طاس — سب نصب تھے جس میں لعل و الماس
خلعت کشتی کے درمیان تھا — گہنا پھولوں کا اک نشان تھا
اس رنگ سے مہندی لے کے دستور — پہنچے پچھلے کو شادو مسرور
مہندی دولھا کے جب لگائی — مرجان نے شکست فاش کھائی
جو نیگ میں سابیوں نے پایا — دولھا وہ سلام کر کے لایا
سب رسموں سے کر کے جلد فرصت — لی جانے کی سمدھنوں نے رخصت
رنگ اپنا بزم میں جما کر — پہنچے رشک ارم میں جا کر
اب صبح سے ہے برات کا غل — آتی ہے صدائے خندۂ گل
مہمان اُتر رہے ہیں پیہم — سامان جلوس ہے فراہم
میراثنیں گیت گا رہی ہیں — انعام و اکرام پا رہی ہیں
تھیں جتنی سہاگنیں طرحدار — صحنک کے لئے ہوئیں وہ تیار
پھرتی سے سارا کام کر کے — دی نذر سب اہتمام کر کے
سب نے مل جل کے تھوڑا تھوڑا — سی ڈالا ریت کا وہ جوڑا
دن بھر رہے اپنے کام میں سب — ناگہ آئی برات کی شب
آراستہ سقف و طاق و ایوان — محفل تھی کہ محفل سلیمان
چھائے قندیل جھاڑ مردنگ — طنبور رباب چنگ مرچنگ
رقصاں وہ طائفے خوش آواز — وہ تان اوپج وہ غمزہ و ناز
ناچی آ کر وہ جس گھڑی گت — ایک ایک کی ہو گئی بری گت
سہرا جو دلھن کے گھر سے آیا — دولھا کو نہانے کو بلایا
دولھا جب ناس وہاں نہایا — خاصہ ایک ایک کو کھلایا

"مرزا محمد عباس حسین ہوش"

---

(۹)

بگڑی صفتِ مزاج سب سے — کہنے لگی جوششِ غضب سے
طوطا صیاد نے اُڑایا — چڑیاں رہیں چپ اُڑیں خدایا
پہرے پہ یہ شجر کھڑے تھے — کانٹے رستے ہی میں پڑے تھے
سوسن کی زباں کیا تھی بےحس — کیا پھوٹ گئی تھی چشمِ نرگس
کیا باغ میں سو رہا تھا سو یا — کلیاں نادان ہی تھیں گویا
شاخوں نے نہ برچھیاں لگائیں — پتوں نے نہ تالیاں بجائیں
پھیلائے ہوئے تھیں جال بیلیں — چلنے دیتیں نہ چال بیلیں
غنچوں کو حجاب کی پڑی تھی — سبزے کو خواب کی پڑی تھی
میرے آیا نہ خاک کام سنبل — مٹ جائے بلا سے نام سنبل
پکڑا کبھی خار نے نہ داماں — زنجیر بنا نہ عشقِ پیچاں
سنتی ہوں ہوا تو گشت میں تھی — شاید اس وقت دشت میں تھی
تا کانہ عدو کو تو نے او تاک — آنکھوں میں پڑی نہ اُڑ کے او خاک
تو نے نہ دیا نسیم جھٹکا — کانٹا بھی تو پاؤں میں نہ کھٹکا
کس سوچ میں تھے یہ سر جھکائے — کچا کوئی ان پھلوں کو کھائے
انگور رہیں مے پرست کمبخت — یکسر پڑے ہوئے مست کمبخت
لب کھول کے حوض کیوں نہ بولا — فوارے نے کیوں دہن نہ کھولا۔
موجیں دوڑیں نہ ہو کے بیتاب — طوق گردن ہوا نہ گرداب
غافل رہے سب حباب جو کے — کیا تھے نہ شریک آبرو کے
سایہ ہی نہ پڑ کے کاش سوتا — بیلا ہی گلے کا ہار ہوتا
قمری کو سرو سے ٹوک دیتی — انگور کی ٹٹی روک لیتی
مہندی ہی جکڑتی ہاتھ پاؤں — رنگت ہی پکڑتی ہاتھ پاؤں
آگاہ مجھے یہ مور کرتے — سر پہ چلاتے شور کرتے
آنے والی نسیم ہے بس — جانے والی شمیم ہے بس
ہے لوث سے پاک انکا دامن — پکڑے کوئی خاک ان کا دامن

غنچوں کو جو کچھ کہوں تو چٹکیں
کانٹوں کا جو نام لوں تو کھٹکیں

پھولوں کو جو کہوں تو منہ پھلائیں
چڑیوں سے جو بولوں غل مچائیں

پھر کون ہے جس پہ کچھ گماں ہو
مہندی کا جو چور ہو تو ہاں ہو

کیا سمجھی تھی میں یہ گل کھلے گا
گلشن سے یہ پھل مجھے ملیگا

نارنجی رنگا کے رنج جھیلا
تقدیر سے کچھ پھلا نہ کیلا

پاجی ہیں یہ سب شریفے سڑ جائیں
بیری ہوئے بیر کیڑے پڑ جائیں

اس نے بھی نہ خاک ادا کیا حق
پالا پالک کو میں نے ناحق

میٹھے سے کھٹائی میں پڑی ہیں
کچا کھا جاؤں گی ابھی میں

بوٹے ہیں یہ دیکھنے کو چھوٹے
یہ جتنے چھوٹے ہیں اتنے کھوٹے

لالہ گمراہ ہے میں سمجھی
دل اس کا سیاہ ہے میں سمجھی

امید بھی - سے بھی ہے خام
رکھئے آسیب سیب کا نام

گلشن پہ پڑے الٰہی پالا
لالے کا چمن میں منہ ہو کالا

ہنستے ہیں یہ گل تباہ ہو جائیں
یہ فالسے روسیاہ ہو جائیں

ہو سرو کا پاؤں شل الٰہی
دنیا میں نہ پائے پھل الٰہی

جڑ پیڑ سے اجڑے چمن تو
ہو جائے سفید یاسمن تو

سڑ سڑ کے ثمر گریں تو خوش ہوں
کٹ کٹ کے شجر گریں تو خوش ہوں

یارب سبزے پہ اوس پڑ جائے
پامال ہوں خار بیل اجڑ جائے

مٹ جائے حباب بے نشاں ہو
یہ سرو چمن رواں دواں ہو

پیڑوں کے سروں پہ برسیں پتھر
جھاڑو پھر جائے اس روش پر

چھاتی پھٹے جڑ کے کھائیں گہرے
غنچے گونگے ہوں پھول بہرے

ٹھنڈی ہوں حوض تو جو گر جائے
پانی تیری آبرو پہ پھر جائے

چوسوں گی انار کا لہو آج
گیندے کو کروں گی زرد رو آج

کاٹوں گی یہ پیڑ جس طرح ساگ
مہتابیوں میں لگاؤں گی آگ

او تخم بگاڑ دوں گی تجھ کو
بس کھود کے گاڑ دوں گی تجھ کو

انگور کی کھینچ لوں گی کھال آج
سنبل کے نوچ لوں گی بال آج

شبّو تیری ناک کاٹ لوں گی
لیموں تجھے آج چاٹ لوں گی

اشجار تنے کھڑے ہیں بدذات
کھودوں انکی جڑیں تو ہے بات

کچّا چڑیوں کو کھاؤں گی میں
دنیا سے انہیں اُڑاؤں گی میں

ناچیں کتنا ہی بن کے طاؤس
ہیں سبز قدم چمن کے طاؤس

ناچ اتنا نچاؤں جتنی کد ہے
دوں داغ پہ داغ تو سند ہے

کیا کیا نہ ستم کرونگی واللہ
مہندی کو قلم کروں گی واللہ

دُور ہو شبنم کہیں فنا ہو
آگے سے نسیم تو ہُوا ہو

چھاتی تیری پھٹ جائے او گُل
اللہ کی مار تجھ پہ سُنبل

قمری کے گلے میں طوق ڈالو
کانٹے یہ کھٹکتے ہیں نکالو

فوّاروں کے لُوٹ لوں خزانے
موجوں کے لگاؤں تازیانے

پیسوں مہندی کو میں جو بس ہو
تلووں سے ملوں جو دسترس ہو

لُو کا لگے جھاڑ میں تو خوش ہوں
پتے جلیں بھاڑ میں تو خوش ہوں

یہ پیڑ نہ ہوں نہال یا رب
سبزہ رہے پائمال یا رب

اچھا پازیب کیوں نہ بولی
کیوں آنکھ نہ آرسی نے کھولی

کیا منہ میں بھرے ہوئے تھے گھنگھرو
چُپ تھے کہ مرے ہُوئے تھے گھنگھرو

مُنہ کھولے رہے مگر نہ بولے
جُوتی سے کڑے اگر نہ بولے

آویزے ہلے نہ کس کے ڈر سے
کیوں نکلے نہ نگینے گھر سے

چھلوں کا چلا نہ جوڑ افسوس
توڑے سے کیا نہ توڑ افسوس

طائر چھپکے سے یوں نکل جائے
پھر کون اسے سر چڑھا کے پھل پائے

یہ بھی نہ ہوئے دستگر افسوس
دل کیوں نہ ہو کنگنوں سے مایوس

ایسے بھی نہ آئیں کام گونجیں
منہ موڑ گئیں تمام گونجیں

مالا میرا جو یار ہوتا
دشمن کے گلے کا ہار ہوتا

بجلی ہی چمک کے پھونک دیتی
چوڑی ہی لپک کے ہاتھ لیتی

سونے والے ہیں یا تو بالے
یا ہیں بالا بنانے والے

نادانی سے یہ بھی گر گئے بیر
موتی ہیں نئیم کیا کہوں خیر

بس بوئے وفا نہیں کسی میں — کانٹا سی چبھی ہے کیل جی میں
ہستی نہیں منہ لگانے والی — صورت نہ دکھائے کالی کالی
اشجار سے کھینچ کے تن گئی وہ — جالا مکڑی کا بن گئی وہ
بگڑی بوٹوں سے داغ کھا کر — روٹھی پھولوں سے منہ پھلا کر
ایسی کنگھی سے الجھی وہ گُل — اُلجھے شانے سے جیسے کاکل
ڈھونڈ آئی ادھر ادھر بھی — طوطے کا پایا اک نہ پر بھی
روئی چلائی غل مچایا — سر پہ سارا چمن اُٹھایا
سنّاٹے میں تھے سب اہلِ گلشن — چپ تھی گونگے کی طرح سوسن
شمشاد کھڑے رہے کنارے — بولے نہ طیور ڈر کے مارے
اُترا صدمے سے چہرۂ گُل — چھٹکے ماتم میں موئے سُنبل
نرگس ہوئی کھا کے خوف بیمار — کانٹے ہوئے سُوکھ سُوکھ کر خار
پتا تھا تو زرد ہو گیا تھا — پانی تھا تو سرد ہو گیا تھا
اوس قسمت کو رو رہی تھی — گُل کا دامن بھگو رہی تھی
موجیں لبِ جو پٹکتی تھیں سر — گرداب کی عقل میں تھا چکر
حیرت تھی کہ قہر ڈھا گیا کون — آخر طوطے کو کھا گیا کون

گر پڑے بہ شکلِ اشک دیدہ
بے ہوش ہوئی ستم رسیدہ

"شوق قدوائی"

مرثیہ

عرب کی شاعری جوش طبیعت سے عالم وجود میں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اور تمام اصناف شاعری سے پہلے مرثیہ کا وجود پایا جاتا ہے کیونکہ مرثیہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق براہ راست جذبات رنج وغم سے ہے۔ جو تمام جذبوں میں قوی ترین جذبہ ہے زمانہ جاہلیت میں یہ فن کافی ترقی کر چکا تھا۔ ابتدائے اسلام میں متمم اور خنساء دو نامور مرثیہ گویوں کی شہرت کا ذکر کتب تاریخ میں پایا جاتا ہے۔

اس وقت تک لوگ مرثیہ جوش طبع یا کسی خاص جذبہ سے متاثر ہو کر کہتے تھے۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد جب شاعری بھیک کا ٹھیکرا بن گئی۔ تو مرثیہ کے فن کو زوال آگیا۔

اسی زمانہ میں کربلا کا دردانگیز واقعہ رُونما ہوا۔ اس وقت نہ تو عرب میں وُہ جوش ہی باقی تھا۔ اور نہ ہی پہلی سی آزادی ہی نصیب تھی۔ بنی اُمیہ کی حکومت کا زور تھا۔ اس لئے چپ ہو کر رہ گئے۔ اور زبان سے اُف تک نہ کر سکے۔

بنی عباسیہ کے زمانہ میں بھی مرثیہ کوئی ترقی نہ کر سکا۔ اب فارسی شاعری کو لیجئے۔ تو وہ تکلف ومداحی کے خارزار سے اُلجھی ہوئی تھی۔ اور جذباتی شاعری کا نام گویا مفقود تھا۔ متقدمین کے دور میں صرف چند شخصوں نے ادھر توجہ کی چنانچہ فردوسی نے سہراب کا دردناک مرثیہ لکھا ہے۔ جو شاہنامہ میں موجُود ہے۔

اس دور کے بعد مرثیئے کم لکھے گئے۔ اور لکھے بھی گئے تو رسمی طور پر۔ البتہ سعدیؒ اور خسرو کے درد وحسرت سے بھرے ہوئے دو مرثیئے کتابوں میں نظر آجاتے ہیں۔

تیموریہ دور میں محتشم کاشی پیدا ہوا۔ جس نے اہلبیت نبویؐ کا مرثیہ لکھا۔ جو درد وغم کی مجسم تصویر ہے۔ محتشم کے بعد مقبل نے مرثیہ گوئی کی طرف خاص توجہ کی۔ بلکہ اس کو اپنا فن ہی بنا لیا۔ اس کے مرثیوں میں اگرچہ اس زمانہ کے لحاظ سے کلام میں زور اور بندش میں چستی نہیں۔ لیکن پھر بھی اس کے مرثیے درد وتاثیر سے لبریز ہیں۔

مقبل کے بعد ایران میں مرثیئے کی بہت سی قسمیں ہو گئیں۔ اور اکثر لوگ اس طرف

مائل ہو گئے۔

اُردو میں مرثیہ کا وجود محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ سے پایا جاتا ہے۔ لیکن اب تک یہ تحقیق نہ ہو سکا۔ کہ مرثیہ کی ابتدا اردو میں کس نے کی۔ یہ یقین ہے۔ کہ سودا اور میر کے زمانہ سے پہلے اس کا رواج ہو چکا تھا۔ میر کے متعلق اگرچہ سُنا گیا ہے۔ کہ اُنھوں نے مرثیے بھی کہے۔ لیکن ان سے ان کا کلیات خالی ہے۔ سودا کے مرثیے ان کے کلیات میں پائے جاتے ہیں۔

پہلے مرثیے غزل کے انداز پر یا چہار مصرع ہوتے تھے۔ سب سے پہلے سودا نے اس میں مسدس کی بنیاد ڈالی۔ میر ضمیر نے اس کو موجودہ طرز کا خلعت بخشا۔ اُنھوں نے اس میں رزم۔ سراپا اور گھوڑے تلوار وغیرہ کی تعریف کو مرثیہ میں داخل کیا۔ واقعہ نگاری کی ابتدا کی کلام میں زور بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی۔ بہت سے غلط اور ناتراشیدہ الفاظ کو متروک کیا۔ ممبر پر بیٹھ کر پڑھنے کی بھی اُنھا ہی نے پہل کی۔

اسی زمانہ میں میر خلیق نے مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے انیس نے اس فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ میر ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر بھی انہیں کے ہمعصر اور مقابل تھے۔ اُنھوں نے بھی مرثیہ گوئی کو کم ترقی نہیں دی۔ یہ دونوں شخصیتیں آفتاب و مہتاب بن کر مرثیہ گوئی کے آسمان پر چمکیں۔ اگرچہ رزم کی بنیاد میر ضمیر نے ڈالی لیکن میر انیس نے اس کو کمال کے درجہ تک پہنچا دیا۔ مناظر قدرت اور جذبات انسانی کے جزئیات کو اس خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہ فارسی میں بھی کوئی ان کا مقابل نظر نہیں آتا۔ ان کا کلام سلامت و روانی کا نمونہ اور محاورہ و روزمرہ کی کان ہے۔

ان کی زندگی ہی میں ان کے بھائیوں (اُنس و مُونس) نے خوب مرثیے لکھے اور داد فصاحت حاصل کی۔ لیکن میر انیس کے سامنے چراغ نہ جل سکا۔ ان لوگوں کے بعد میر انیس کے بیٹے میر نفیس نے مرثیہ گوئی میں کافی شہرت حاصل کی مرزا دبیر کے بیٹے مرزا اوج نے بھی بڑے زوردار مرثیے لکھے۔ رشید لکھنوی نے اس میں ساقی نامہ اور بہاریہ مضامین کا اور اضافہ کر دیا۔ ان کے بعد گو اور مرثیہ گو پیدا ہوئے۔ لیکن ان کے مرثیوں میں کوئی جدت یا خاص بات نہیں پائی جاتی کہ ان کا ذکر یہاں کیا جا سکے۔[۱]

۱؎ اس مضمون کی تحریر میں موازنۂ انیس و دبیر پیش نظر رکھا گیا ہے۔

مراثی

(۱)

چمن میں آتی ہے کیسی یہ رت مرے نین سے کوئی نہارے
ہوا کی چھاتی پہ ہال ہر مرغ کھینچتا ہے الم کے آرے

جو چاہے اک لحظہ جگ میں آوے نہیں ہے یہ دخل خوشدلی کو
فلک سے گویا غم و الم نے لیا ہے باغ جہاں اجارے

بحال آتی نہیں ہے کیوں ہیں نسیم گلشن ضعف غم سے
چھڑک چھڑک کر چمن کے مالی سکھا سکھا کر سحاب ہارے

نین سے نرگس کے نیند ایسی گئی الم سے کہ پھر نہ آئی
کہانی کہہ کہہ کے طوطے ہارے تھکا ہے ہُدہُد بھی دے ہنکارے

تمام سرو آج پاؤں ٹیکے کھڑے ہوئے آہ بھر رہے ہیں
ٹیک کے اورنگ اپنی پگڑی برہنہ سر ہو گئے ہیں سارے

یہ رنگ نالے کا ہے الم سے ہر ایک بلبل کا شاخ اوپر
کسی کی جس طرح نعش اوپر کھڑا ہو نوحہ کرے پکارے

کوئی یہ سوچے تو یار وسوسن کی نیلی کسوت کا کیا ہے موجب
سبب اس آشفتگی سنبل کا دل میں اپنے کوئی بچارے

فقط نہ لالے کے پھول سے کچھ جگر پہ کھاتے ہیں داغ غم سے
تمام ٹکڑے ہوا ہے اپنا الم سے نوچیں ہیں منہ ہزارے

ملا کے ماٹی میں جیسے پانی لحد کے بھرنے کو سانتے ہیں
چمن میں رو رو کے رات شبنم اسی طرح سے کرے ہے کارے
نہ آہ گلشن میں سرو ہی کے جگر کو تنہا کرے ہے سوسن
جو نعرہ قمری کا جا کے سنیئے تو وہ بھی جی کے ورق اُتارے
بندھی ہے نرگس کی ٹکٹکی یوں طرف ہزار یکے ہر چمن میں
کہ لوتھ جس طرح خون ناحق کی ہو کے حیران کوئی نہارے
صبا کھلاتی ہے جن گلوں کو تنوں کے زخموں کی وہ نئے ہیں
جو اور غنچہ کہ ادھ کھلے ہیں کتنے گلوں کے ہیں وہ انبارے
ادھر جو دیکھو تو صحن گلشن میں ڈھار مار آبشار رو دیں
اُدھر کناری سے موج جو کی حباب ہر ایک پیٹ مارے
نہیں ہے بیوجہ کچھ یہ حالت خبر لو جلدی کہ آج کوئی
ہوا ہے پیاسا ستم کے خنجر سے ذبح دریا کے جا کنارے
مجھے تو معلوم ہوئے ہے یوں یہ شخص وہ ہے کہ جس کو جیب
رسول کہتے ہیں گود لے کر ترے تصدق حسین پیارے
سوا اُس کے تن پر سوائے شمشیر و تیر و نیزہ کے زخم ہیں یہ
قیاس کیجے تو نہ فلک پر نہوئیں گے اس قدر ستارے
کنارے دریا کے یہ ہوا ظلم پورساتی کوثر اوپر
کہ دھار پانی کی حلق اُس کے گئی نہ غیر از خنجر دو دھارے
جگر کا پیوند فاطمہ کا پڑا ہے یوں آج حوض خون میں
کہ اُسکی رگ رگ سے چھٹ رہے ہیں لہو کے سر تا قدم پھوارے
پڑے ہیں گرد اُسکے ٹکڑے ٹکڑے جو خویش و فرزند خاک و خون میں
نہ گور اُن کو نہ ہے کفن اب نہ اُن کو تابوت نہ گہوارے
سر اُس کا اُن گیسوؤں سے باندھا ہے ظالموں نے سناں کے اوپر
کہ جن کو دھو دھو کے شانہ کر کر مدام بنت نبی سنوارے
سروں کو ساتھ اسکے سر کے تیر دل آ کے رکھ لے چلے ہیں ظالم

اسیر اونٹوں پہ اس کے پیچھے ہیں اہلبیت اُسکے سب بچارے
جو ایک فرزند تیغ کیں سے عزیزوں میں اُسکے بچ رہا ہے
کوئی ڈراتا ہے اس کو برچھے سے کوئی ہے تازیانہ مارے
یہ حال اس کا ہے تشنگی سے بغیر پانی قدم قدم پر
کہ ایک قطرے کے واسطے جون دہن کو اپنے صدف پسارے
نہ ساتھ ایسا رفیق کوئی سنبھالے اس ناتواں کو آکر
نہ ہاتھ اُس کے عصا ہے ایسا چلے وہ جس کے ذرا سہارے
سکینہ دختر جو اسکی ہے سو لہو کے آنسو سے رو رو کر اب
سر اپنے بابا کا دیکھ نیزہ پہ بابا بابا ہے کہہ پکارے
سوائے اُسکے ہے یہ مصیبت اب ان پہ یارو سو کیا کہوں میں
ہنوز ٹپکے ہے خون کانوں سے جن سے چھینے ہیں گوشوارے
کہیں ہیں زینب سخن یہ ہر دم طرف مدینے کے مُنہ کر اپنا
خبر ہماری لو یا محمدؐ نہیں ہیں تم بن کوئی ہمارے
سوا تمہارے نہیں اب ایسا کہ جس سے کہیے مصیبت اپنی
جو والی وارث تھے تن انہوں کے پڑے ہیں زمیں سر و نسے نیارے
زمین کربل کی آل تیری کے واسطے اب ہوئی ہے مسلخ
کہ اس جگہ میں ہوئے ہیں تیغ ستم سے آکر یہ ذبح سارے
ہے لخت دل ان میں کوئی تیرا ہے کوئی تیرے جگر کا ٹکڑا
یہ جتنی لوتھیں پڑی ہیں بن میں سو تیرے سب ہیں عزیز پیارے
بڑے سے سنے ظالموں نے جیتا رکھا نہ چھوٹے تلک ہمارا
کسی کو ہووے گی یہ شقاوت جو چھ مہینے کا طفل مارے
انہوں نے اُمّت کہلا کے تیری یہ ظلم ہم پر کیا ہے اب تو
یہ روز محشر میں منہ کو اپنے دکھاوینگے تجھ کو خاک بارے
غرضکہ زینب یہ باتیں کرتی تھی رو رو مقتل پہ شاہ دیں کے
سرشک گرتا تھا یوں نین سے فلک سے ٹوٹے ہیں جو ستارے

بس آگے خاموش ہو تو سودا زیادہ اس سے نہیں ہے طاقت
کہے گا کب تک کہ اس بیان کے ہوئے ہیں بیہوش سننے ہارے

فلک نے کربلا میں ابر جس دن ظلم کا چھایا
کمانِ جور کو قوس قزح کی طرح چڑھوایا

سوا پیکان کے اک قطرہ نہ اس ظالم نے برسایا
کھوں کیا تیر باراں سے نبی کے گھر کو ڈبوایا

صدائے العطش فریاد سے موزونکی تھی کیا کم
زمین پر عنکبوت سرخ خوں کی بوند تھی ہر دم

کیا تھا پے بہ پے چلنے وہاں تیرونکی یہ عالم
گھٹائیں دار کر پلکوں کی پر گیری کو دکھلایا

نظر کر کو کلا کو کے تھی اس ساون کی اندھیاری
بھرے ہیں جل تھل اور پانی جہاں دیکھو وہاں جاری

وفورِ آب پر اتنی فلک ایسی جفا کاری
جگر گوشے کو پیغمبر کے پیاسا ذبح کروایا

یہ موسم وہ ہے جس میں ہر کوئی چھپر چھواتا ہے
پکھیرو تنکے چن چن گھونسلا اپنا بناتا ہے

کوئی اس وقت چھوٹے سے بھی ظالم گھر چھوڑاتا ہے
پڑا ہے سرورِ دین واں جہاں نہ سر نہ ہے سایا

مقام ہو نظر آتا ہے وہ دشت بلا سارا
جو شب کو برق چمکے تو اُجالا ورنہ اندھیارا

پڑا ہے اس میں وہ بیجان وطن سے ہو کے آوارا
کہ جس کو فاطمہ نے بر میں پیغمبر کے ملوایا

فراہم اُس جگہ حشرات اس موسم کے سارے ہیں
تنِ نازک پہ اُس کے ڈانس جا جا ڈنک مارتے ہیں

اندھیری رات ہے چاروں طرف جھنگر جھنکارتے ہیں
پڑا ہے اس طرح مذبوح واں زہرا کا وہ جایا

زمین اُس دشت کی جن نے سر فصل آ کے جتوائی
کبھو اُس کی زراعت میں سے اک پتی نہ مرجھائی

نبی کی کھیت کی کشتی کی صورت یوں نظر آئی
جو سر کو باں پڑا دیکھا تو پاؤں واں پڑا پایا

پپیہا منہ میں لا کر واں کہیں سے بوند پانی کی
اڑے ہے آ کے ہر اک نعش پر کہتا ہوا پی پی

پیے پانی تو وہ کوئی کہ جس کے تن میں ہووے جی
ترحم لیکن اُس کے دل میں ان کے حال پر آیا

روایت ہے کہ جب اُن کافروں نے روک کر پانی
کیا تنگ اُس جگہ عرصہ زراہ نامسلمانی

حرم پر تشنگی کی دیکھ کر عباس طغیانی
مسلح ہو کے پانی کے لئے مشکیزہ منگوایا

طلب کی رخصت آ بھائی سے کر میدان کی تیاری
کیا عرض اب جسے چاہو اُسے سونپو عملداری

یہی آئی ہے دل میں لہر سن عورات کی زاری
دیا سر یا تو میں دریا پہ جایا مشک بھر لایا

سُنا عباس سے جب اس کو شاہ دین و دنیا نے
کرواؤں در کروروں اشک آنکھوں سے لگے آنے

کہا جان برادر اپنے جیتے جی نہ دوں جانے
کہے گی خلق سر بھائی کا آگے دے کے کٹوایا

غرض رخصت پہ یکدیگر میں یہ الحاح وزاری تھی
کبھو مانند برق آپس میں اُن کو بیقراری تھی
چلا عباس جب تو بوس زین پر مشک کو دھر کر
رکھا جس نے قدم تک آکے اپنا چھوڑ کر لشکر
جگہ سے اپنی کوئی خوف کے مارے نہ ہلتا تھا
کوئی دیکھ اُن کے حربوں کو وہ اپنے واں سے ملتا تھا
جو ہیں چاہا پیے چلّو میں پانی بیش وکم بھر کر
چلا پیاسا ہی واں سے مشک کو سعی عدم بھر کر
یہ ماری بانگ تب لشکر پہ ابن سعد ملعون نے
جو پہنچا مشک اب لے کر تو مارے جاؤ گے دو نے
یہ سُن کر فوج شام اُس پر گھٹا سی چھا گئی آکر
کیا جون رعد یہ نعرہ طرح بجلی کے بل کھا کر
کہا اتمام حجت کے لئے عباس نے اُس دم
جو اس پانی کو تم دو گے تو کیا دریا سے ہو گا کم
حرم کے بیچ مستورات میری راہ تکتی ہیں
نبی کی دختریں اک بوند کے خاطر بلکتی ہیں
کیا ہے بند فرزندوں پہ آب از چار سو تم نے
سخن میرا یقین ہی جان لو اس مشک کو تم نے
اگر اس مشک کو میں جا کے دوں فرزند حیدر کو
عوض اس آب کے دوں بلکہ آب حوض کوثر کو
نمانا جب تو بیٹھا فوج میں وہ اشجع عالم
جدھر کو رُخ کیا کشتوں کے پشتے واں ہوئے اُس دم
کھوں کیا جس طرح چھایا تھا ابر آہن کا اُس پہ
سنجانے آہ واویلا کہ اس میں کن نے واں آکر
جوانمردی سے وہیں مشک دست راست پہ لی

کبھو جون ابر باہم منہ پہ منہ رکھ اشکباری تھی
مرخص اس طرح سالار دین نے اس کو فرمایا
تو لائے رُوے میدان کا فر اُس کے قصد پر اثر
جہنم کو اُسے و دہین اجل کے ہاتھ بھجوایا
چلے تھا نیزہ اُس جا سے جہاں سے تیر چلتا تھا
لب دریا تلک اپنے تئیں ہر طرح پہنچایا
بیاد تشنگان وہ رہ گیا پھر سرد دم بھر کر
عنان کو پھیر کر مرکب کے دریا سے نکل آیا
کہ یہ تنہا چلا کر خانۂ زین سیکڑوں سو نے
اسے نبھنے دیا تم نے تو سب کو قتل کروایا
پر اُن نے بھی علم کر تیغ اُس کے سامنے جا کر
کہ بہتوں کے جگر پھٹ کر لہو آنکھوں سے تر آیا
سُنو میرا سخن اے بدترین خلقت آدم
دواب اپنے کو جس پانی سے تم نے سیر کروایا
زبانیں تشنگی سے ان کی تالو سے جھلستی ہیں
اُنھیں پانی پیے کو آج یہ دن تیسرا آیا
جگہ رکھی نہ پیغمبر کے دکھلانے کو رو تم نے
جو خالی آب سے کی گور کو آتش سے بھروایا
قسم لو گر قصاص اس ظلم کا لوں روز محشر کو
غرض سب طرح اُن شقیوں کو اُس سرور نے سمجھایا
لگی تب صف بصف لشکر کی ہونے درہم و برہم
اُدھر خون کے بہے نالے جدھر اُس کا پڑا سایا
سنان پر تیغ برسے تھی برچھی اور تیغ پر خنجر
حوالے تیغ کی اُس کے کہ دست چپ لٹک آیا
کہ بوند اس میں سے پانی کی زمین اوپر نہ گرنے دی

فلک ناخوش ہوا اتنا شجاعت دیکھ یہ اُس کی
کہ دست راست بھی اُس کا وہیں شانے سے گرویا

جو تھا نبی مشک دانتوں سے تو کی بوچھار تیروں کی
لگی چاروں طرف سے ہونے مارا مار تیروں کی

ستم کیشوں نے کی پیکان اپنی پار تیروں کی
کہ اُس کو مشک سے اک پل میں کر غربال دکھلایا

سبب زخموں کی حالت اُس پہ جب تازہ ہوئی غش کی
ندا گرتے ہوئے کی یا اخا اور کئی اور کئی

سدا جو ہیں یہ شاہ کربلا کے کان میں پہنچی
بسان ابر گریان آپ کو اُس پاس پہنچایا

پر اس احوال کو راوی نے یوں اخبار میں لکھا
کہ جب تک پہنچے ہی پہنچے سرور سینۂ زہرا

بطعن نیزہ تن کا گوشت اس کے لیگئے اعدا
نشان جز استخوان اُس کا نہ شاہ دین نے کچھ پایا

خمش سودا و گریہ یان بعد اے جا ئیں گے نالے
ہوئے ہیں اولتی مژگان خلق اور چشم پرنالے

جہان کو دیکھتے آئے جہان کے دیکھنے والے
فلک نے لیکن ایسا مینہ نہ دیکھا ہے نہ دکھلایا

گیا میں صبح جو با چشم اشکبار افسوس
کہا کسی نے گیا کیون تو ہو کے زار افسوس

میں بولا اس لئے کرتا ہوں رو کے یار افسوس
نہال عمر کہ برگش غم ست و بار افسوس

اگر بگریہ نشد سبز صد ہزار افسوس

وہ بولا تخم عمل چاہے جس طرح سے بو
تو سبز ہونے سے اُسکے امید دل سے نکھو

میں ایک بات بتاؤں کہ سبز ہوئے ہو
غم حسین میں جتنا تو رو سکے ہے رو

سحر سے شام تلک کر کے لاکھ بار افسوس

اگرچہ خانۂ دنیا میں ہے سراپا غم
ولے رکھے ہے تفاوت بہت زغم تا غم

عزیز کیا کہوں تجھ سے میں ہے یہ کیسا غم
نبی کی آل کا اولاد مرتضےٰ کا غم

جنہوں کے غم سے رکھیں دشت کوہسار افسوس

کہوں زروے کتب تجھ سے جانگداز سخن
اسیر قتل کے بعد از جو ہو کے اہل محن

بسوئے شام چلے لٹ لٹا کے عریان تن
کہا یہ سر بفلک کر لہو سے بھر کے نین

امید تجھ سے ہمیں یہ تھی روزگار افسوس

ہمارے واسطے خدمت کے تو ہوا تھا خلق
دیا حق اژدوں کو تو نے ہمارا کاٹ کے حلق

ہمارے تن پہ نہ غارت گردن نے چھوڑا دلق
نبی کی آل کے دل کا خوش آیا تجھ کو قلق

ہوا یہ ظلم تجھے ہم پہ ناگوار افسوس

جب اُس جگہ سے ہُوا اُن کا قتلگہ پہ گزر — گئی ہر ایک کی تب سوئے عرش آہ جگر
نظر جو آ گئی زین العبا کو نعش پدر — اور اُس کو نعش پدر پر نظر نہ آیا سر
یہ بولا اُس تن بے سر کے لگ کنار افسوس

تو خاک و خون میں پڑا کیوں ہے چھوڑ کر ڈیرا — میں تیرے سر کے تصدق کہاں ہے سر تیرا
غم یتیمی نے دل کو مرے بہت گھیرا — یہ کاش کاٹتے تجھ سر کے بدلے سر میرا
جیوں میں یوں تو مرے اے بزرگوار افسوس

ترے سرہانے جو فرصت ہو بیٹھ روؤں میں — غبار تن کا ترے آنکھوں سے دھوؤں میں
جی اپنا مجھ کنے ہتھیار ہو تو کھوؤں میں — ترے قدم تلے تیری طرح سے سوؤں میں
میں کیا کروں نہیں میرا کچھ اختیار افسوس

بجز خدا کے یہ بندہ دکھ اپنا کس سے کہے — اگر پہاڑ پہ ہو دکھ مرا تو وہ نہ سہے
میں اور دیکھوں کہ پیکے سے تیرے خون بہے — ترے بدن پہ ترا سر نہ تیغ کین سے رہے
سر اپنا دیکھوں تن اپنے پہ برقرار افسوس

دکھ اپنے دل کا کہوں کس سے اے پدر ہیہات — کوئی رہا ہے کہوں جس سے سوز دل کی بات
کٹے گی کس طرح اس داغ سے مری اوقات — ہے قریب ترے قتلگہ سے آب فرات
نہ تیرے حلق میں پانی کی پہنچے دھار افسوس

یہ زخم ناوک دل دوز ہیں ترے تن پر — کہ نہ فلک پہ نہ ہوئیں گے اس قدر اختر
جگہ کوئی نہیں ثابت جدھر پڑے ہے نظر — میں دیکھوں جیتے جی اپنے ترا یہ حال پدر
کہ تجھ بدن سے ہو پیکان تیر پار افسوس

ہوئی ہے کس پہ مصیبت یہ زیر چرخ کہن — کہ بعد مرگ کیا ہو نہ اس کو دفن کفن
یہ گرد و خاک میں لوہو بھرا پڑا ہے بدن — بتا مجھے تجھے یوں کیوں کہ دیکھیں میرے نین
کہ تیرے تن پہ کفن کا نہیں ہے تار افسوس

ترا تو اے پدر اس دشت میں ہے یہ کچھ حال — دکھاویں کس کو گزرتا ہے ہم پہ جو احوال
کروڑ طرح کی آفت ہمارے ہے دنبال — عجب طرح کی مصیبت میں ہیں ترے اطفال
ز شامیان ستم پیشہ نابکار افسوس

ترا تو دشت میں جوں گوسپند کاٹ کے سر — رکھا ہے آج کے دن ظالموں نے نیزے پر

پھرے ہیں لے تیری عزت کو اونٹوں پر گھر گھر
نہ منہ پہ اُن کے ہے معجز نہ سر پہ ہے چادر
کریں ہیں یہ عمل امت کے دین دار افسوس

تھے اس طرح کی جفا کے یہ لوگ کب قابل
کہ ان پہ جور کریں یاں تلک یہ سنگین دل
نہ ہوئے پشت پہ اونٹوں کی چین انہیں اک پل
ستمگران جہاں کھینچتے کو ہر منزل
مریض مجھ سے کے دین ہاتھ میں مہار افسوس

ہمیں لٹے ہوئے اس طرح شام جاتے ہیں
اب آگے دیکھئے کیا کیا ستم دکھاتے ہیں
اُدھر سے جیتے جی اپنے ادھر کو آتے ہیں
وہیں کی خاک میں یا جا کے ہم سماتے ہیں
اگر یوں نہیں ہے نصیبوں میں تو ہزار افسوس

اب آرزو ہے یہی دل میں بس میرا جو چلے
اُدھر سے پھر کے گردوں میں ترے قدم کے تلے
مدینے جاؤں میں کس طرح منہ سے خاک ملے
کٹا کے اپنے عزیزوں کے اُس جگہ پہ گلے
کرے تھا حرف یہ کہہ کہہ کے بار بار افسوس

غرض کہ رو رو یہ کہتے تھے حضرت سجاد
پدر کی لاش پہ با آہ و نالۂ و فریاد
ندان گردش گردوں دون بد بنیاد
حرم کو لے گئے تا شام با دل ناشاد
اب آگے کیا کہوں میں تف بروزگار افسوس

جو کربلا میں بلا کا ہوا ہے اُن پہ گذار
زبان وہ کونسی ہے جس سے اُس کا ہو اظہار
محبت اُن کی نے پایا ہے جس کے دل میں قرار
یہ چاہیئے کہ بہ تعداد برگ ہر اشجار
اب انگنت وہ کرے حیف و بے شمار افسوس

بیان تمام نہ ہو سو اب تو اس غم کا
جو اتفاق کرے ناطقہ دو عالم کا
نہ ذکر ہے شہ کون و مکان کے ماتم کا
اب آگے دور ادب سے ہے مار نادم کا
مگر کیا کرے ہر لیل و ہر نہار افسوس

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تیری بیدادی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی
جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذا دی
یاں تلک پہنچی ہے ملعون تری جلادی
کوئی فرزند علی پر یہ ستم کرتا ہے
کیوں مکافات سے اسکے تو نہیں ڈرتا ہے

وہ علی ابن ابو طالب و داماد رسول   وہ علی جس سے بیاہی تھی محمدؐ نے بتول
وہ علی جس کا سخن ہوویگا محشر میں قبول   اُس کے فرزند تری تیغ سے ہوویں مقتول

آدمی ہی نہیں تنہا ترے ہاتھوں غمناک
جن اور حور و ملک ڈالتے ہیں سر پر خاک

یہ وہ فرزند علی تھا کہ جسے صبح و شام   آکے روح الامین کرتا تھا مدینے میں سلام
اور کہتے تھے سبھی خرد و کلاں ہل کے تمام   جن و انسان و ملک حور کا بیشک ہے امام

اُس کو کربل میں کیا ذبح پیاسا ہیہات
کیا دکھاویگا محمد کو تو اب روبد ذات

خویش و فرزند و عزیز اس کے تھے جتنے پیارے   دشنہ و تیغ سے تین ظالموں کے سب مارے
اہل بیت اس کے جو باقی ہیں سو ہیں آوارے   قید میں کوفیوں کے جاتے ہیں وہ بیچارے

نہ انہیں چین ہے دن کو نہ انہیں رات آرام
اس مصیبت میں چلے جاتے ہیں کربل سے شام

لئے جاتے ہیں وہ جس راہ سے ہے خارستان   نہیں تالاب و کوئیں کا کسی منزل میں نشان
پا برہنہ چلے واں زین عبا تشنہ دہان   سر کھلے اور وہ اشخاص بہ پشت شتران

جن کے محمل کی طرف دیکھ نہ سکتا تھا فلک
مہر و مہ کی نہ پڑی جن پہ نظر آج تلک

اس طرح جاتے ہیں گرد اُن کے چلے وہ کفار   کسی کے ہاتھ میں ہے دف کسی کے ہاتھ ستار
مست و سرشار ہر اک کیف میں کھینچے تلوار   عابدین کے تئیں جاتے تھے ڈرلاتے ہر بار

کیا کرے ہائے وہ اس کا کوئی غم خوار نہیں
اب سواروں کے کچھ اس کو سرو کار نہیں

لئے جاتی ہے جو اس کو سپہ ظلم کی صف   کوئی ان میں نہیں ایسا جو کرے اُن کی طرف
پیٹ کر منہ کو یہ کہتا ہے کہ یا شاہ نجف   سر بنایا ہے مرے باپ کا نیزے پہ ہدف

گھوڑے دوڑا کے اُسے مارتے جاتے ہیں تیر
جو کماندار تھے اُس فوج ستم میں بے پیر

ایک تو آتش غم سے جگر اُس کا ہے کباب   دوسرے شدت گرما سے نپٹ ہے بیتاب

اور مانگے ہے کسی سے وہ اگر قطرۂ آب   عوض آب وہ دیتا ہے درشتی سے جواب
جو جگر ساقیٔ کوثر کا ہو سبحان اللہ
پیاس کے غلبے سے اس شخص کا ہو حال تباہ

غرض اس طرح کی ایذاؤں سے عابد کے تئیں   لے گئے شام تلک ساتھ حرم کے وہ لعین
داخل کفر ہوئے چھوڑ محمدؐ کا دین   آخرکار لعینوں نے لطشت زرین
لے گئے رکھ کے بشاشت سے سر شاہ شہید
جس جگہ بیٹھا تھا دیوان کئے ملعون یزید

رجز پڑھتے ہوئے آئے وہ لعین لے کر سر   اسپ مانگے تھا کوئی اُن میں کوئی خلعت زر
شمر ملعون عمر سعد پھر آگے آ کر   عرض کرنے لگے یوں سامنے اس طشت کو دھر
لائے ہیں آج سر اُس کا ترے فرمائے سے
جس کا رتبہ ہے بڑا عرش کے بھی پائے سے

یہ وہ سر ہے جو رہا دوش محمدؐ پہ مدام   لائے کربل سے جسے رکھ کے سنان پر تا شام
اہل بیت اُس کے یہ زنجیر میں حاضر ہیں تمام   دے شتابی ہمیں جو تجھ کو ہے دینا انعام
کام ہم نے یہ خلافت کے لئے تیرا کیا
کہ سبب جس کے سے دین اپنے کو برباد کیا

مستقل تا کہ ہو تم دین سے ہم منہ موڑا   ایک کو آل محمدؐ سے نہ جیتا چھوڑا
مزد تو دے ہمیں کس چیز کا ہے یاں توڑا   کسی کو بخشش تو گھوڑا دے کسی کو جوڑا
اتنے ہی واسطے کرتا ہے سپاہی محنت
تا کہ محنت کے عوض دے اُسے آقا راحت

سنتے ہی اُس کے یزید اُس سے یہ کہنے لاگا   کیا حسین ابن علی کا کوئی ایسا نہ بچا
جس کو پھر مجھ سے خلافت کا نہ ہووے دعوا   ایک ملعون نے ان میں سے یہ سُن کر کے کہا
ایک بیمار سا لڑکا ہے کوئی عابد نام
طوق و زنجیر میں رہتا ہے وہ اب صبح و شام

سو وہ اس حال سے البتہ نہیں جینے کا   کہاں مقدور ہے اب اُس کو دوا پینے کا
جینے دیتا ہے کوئی داغ اُسے سینے کا   کیا ہے وسواس تجھے ایسے کے اب جینے کا

وہ بھی حاضر ہے جو حق اُس کے ہیں چاہے سو کہو
جس طرح مانے نہیں مزدیں دے خلعت و زر

سُن اُسے عابد بیمار کو با خیل حرم — روبرو اپنے طلب کرنے لگا وہ اظلم
کیا کہوں جیسی مصیبت سے وہ آئے اس دم — تاب عابد کو نہ اُس آن تھی رکھنے کی قدم
سر سے پاؤں تلک ضعف سے وہ لرزاں تھا
دیکھ نیرنگی گردوں کے تئیں حیران تھا

اُس لعین نے یہ کیا دیکھ کے عابد کو خطاب — کیوں ترا باپ لڑا گر نہ تھی لڑنے کی تاب
رد بیعت سے مرے گھر کو کیا اپنے خراب — آپ تو جی سے گیا تجھ پہ یہ ڈالا ہے عذاب
ہے گلے طوق ترے پاؤں میں تیرے زنجیر
دیکھتے ہیں تجھے اس حال سے برنا و پیر

سنتے ہی اس کو وہ سرور یہ زباں پر لایا — کیا ہوا گردش دوران سے جو میں دُکھ پایا
جو کیا باپ نے میرے وہ خدا کو بھایا — مفت اپنا تو جہنم میں مکان بنوایا
راہ میں حق کے مرے باپ نے باندھی تھی کمر
گو کہ کاٹا گیا اس راہ میں اب اُس کا سر

اُس سخن سے جو برآشفتہ ہوا وہ شدّاد — قتل عابد پہ کیا امر بلا کر جلاد
دیکھ اس حال کو زینب لگی کرنے فریاد — اے یزید اتنی نہ کر ہم پہ تو آگے بیداد
رحم کر حال ہمارے پہ یہ بیکس ہے یتیم
روز محشر سے تو ڈر اور خدا کا کر بیم

جانتا ہے یہ ترے سامنے ہے سر کس کا — بوسہ لیتے تھے ہر اک آن محمدؐ کس کا
گیسو دھوتے نہ کبھو بال جگہ ہے کس کا — ظلم کی تیغ سے ٹکڑے کیا تیں تن کس کا
قتل پر ایسوں کے رہتا ہے تو اتنا سرگرم
لاج کچھ بھی ہے تجھے حق سے محمدؐ سے شرم

راوی کہتا ہے غرض جب یہ کہا زینب نے — ایسی تاثیر کی اُن باتوں کے کچھ مطلب نے
رویا نہ چرخ پہ خوں دیدۂ ہر کوکب نے — اُس ستمگر سے شفاعت کی کھڑے ہو سب نے
ہو کے ناچار وہ اس خون سے تو در گذرا

دغدغہ جینے کا عابد کے دلے اس کو رہا

سودا اب چشم محباں کو ہے یہ نظم جلا | پاوے گا اس کا محمدؐ سے تو محشر میں صلا
تجھ کو جنت میں ہر اک بیت پہ گھر دینگے ولا | سننے سے جس کے یہ اشک آنکھوں سے آتا ہے ملا

سن کے اس مرثیے کو بزم میں جو رووےگا
آب چشم اس کا گناہوں کو ترے دھووےگا

کیا چرخ واژگون کا ستم اب کروں بیان | تاریک کر دیا ہے محمدؐ کا خانمان
سونا ہے بے مکین مدینے کا ہر مکان | پیٹے ہیں سر کو آج یہی کہہ کے انس و جان
خورشید آسمان و زمین نور مشرقین | پروردۂ کنار رسول خدا حسینؑ

کاری رین ڈراونی گھر تین ہوئے نراس
جنگل میں جا سوئے رہے کوؤ آہں نہ پاس

جب رن میں آکے ٹھور وہ سالار دین رہا | یوں پیک غم نے آکے وہیں گھر بہ گھر کہا
آل نبی نے ہائے یہ کیسا ستم سہا | اہل حرم پھرے ہے یہ کہتا بہا بہا
کشتی شکست خوردۂ طوفان کربلا | در خاک و خون فتادہ بمیدان کربلا

دارو سے یان نیر بن کیو ہٹ کو مار
بیری بھیے یا ناؤ کے بیچ ٹیک کے دھار

جب زیر تیغ آچکے دشت بلا میں سب | جز عابدین رہا نہ کوئی زینت نسب
ہیہات کیا بیان کروں اس وقت کا تعب | جس وقت گرد خیمے کے پہنچے وہ بے ادب
آن دم فلک بر آتش غیرت سپند شد | کز بیم خصم در حرم افغان بلند شد

بیری پہنچے آئے کے تیری دہلی پاس
بیگ خبر لو یا نبی اب پت کی نہیں ہے آس

جس دم گرا وہ زین سے بصحرائے کربلا | جس لحظہ اس کے سر کو بدن سے جدا کیا
جس آن سب شہید ہوئے اس کے اقربا | جس وقت خیمہ گاہ میں بیٹھے وہ اشقیا
کاش آن زمان سرادق گردوں نگوں شدے | این خرگہ بلند ستون بے ستون شدے

گج کھینچ چھون اور سے پڑے وہ جالم ٹوٹ

بیووں کو ڈر بائے کے لے گئے گھر کو لوٹ

یوں لے چلے حرم کو سوے شام جور کیش   اونٹوں پہ بیبیاں ہیں دل افگار سینہ ریش
تیروں کی نوک پر تھے سر اقربا و خویش   سر شاہ دین کے دیکھ کہ ان سب کے پیش پیش
روح الامین نہادہ بزانو سر حجاب   تاریک شد ز دیدن او چشم آفتاب

کہیں حرم سر پیٹ کر کھا کر اپنی لاج
ماٹی میں تورل گیو دین دنی کے تاج

جس دم کہ قتل گہ میں حرم کا ہوا گذر   بھائی کے تن پہ جا پڑی زینب کی وہاں نظر
دیکھا کہ تن ہے خاک میں نوک سنان پہ سر   منہ کر طرف مدینے کے بولی یہ پیٹ کر
این کشتۂ فتادہ بہامون حسین تست   این صید دست و پا زدہ در خون حسین تست

سیس کاٹ کے لے چلے تن ماٹی کے بیچ
کہت حسینا دیکھ لے جگ کی اونچ اور نیچ

ایدھر پڑا حسینؑ اُدھر اصغر حسینؑ   گرد اس کے ٹکڑے ٹکڑے علی اکبر حسینؑ
پشت شتر پہ بیٹھی ہوئی خواہر حسینؑ   کہتی ہیں اُس سے ہوتی اگر مادر حسینؑ
اے مونس شکستہ دلاں حال ما ببین   ما را غریب و بے کس و بے آشنا ببین

بھائی بھتیجے بھانجے رن میں جو جھے آے
کوؤ نہیں جو آے کے منہ میں پانی چواے

مردان کے پسر نے چھڑا ہم سے اب وطن   کربل میں قتل و قید گئے سارے مرد و زن
نے پیرہن ہمیں نہ اُنھوں کو دیا کفن   چھوٹیں جو اس لعین سے تو پہنچیں سوے مدن
بالضعفۃ الرسول ز ابن زیاد داد   کو خاک اہلبیت رسالت بباد داد

جیت دین کو پہنچیو کٹھن ہے ما کی ہاتھ
ہتو سنگھالی مار کے بیسری دینی ہاتھ

زہرا کا غم مجھے ہے اُسے تھا غم نبی   عابد کو غم حسین کا اُس کو غم علی
پشتوں سے ہمیں تو صعوبت نصیب کی   روز ازل سے ہم کو مصیبت ہے دی سودی
بر خوان غم چو عالمیان را صلا زدند   اوّل صلا بسلسلۂ انبیا زدند

منتر پڑھی نیت کی کبھو نہ کیھو سکھ

بھرتے آئے ہیں ہمیں جنم جنم کو دکھ

اس دشت پر بلا میں تہ تیغ آبدار — لے کر ہوئے جوان سے تا طفل شیرخوار
پالاں نہیں ہے جن کے اُن اونٹوں پہ ہم سوار — عابد برہنہ پاؤں کی ہے ہاتھ میں مہار
تا چرخ سفلہ بود خطائے چنیں نہ کرد — بر ہیچ آفریدہ جفائے چنین نہ کرد

دیکھیں نے سنسار کی ہمون دیکھ سہی
کن نے جگ میں آئے کے ایسی بیت سہی

گو کو فیاں ستم سے ہمارا ابھی جان لین — ظلم ان کا اس جگہ تو کسی سے نہ ہم کہیں
جتنا دیا ہے دکھ ہمیں اس سے زیادہ دین — معلوم ہو رہیگا مزا حشر میں اُنہیں
آل نبی چو دست تظلم بر آورند — ارکان عرش را بتزلزل در آورند

جب دکھیارے عرش کو پایون پکڑ ہلائیں
تب ہیں تم کو اپنے کرتب جانیں جائیں

زینب غرضکہ کرتی تھی جس وقت یہ بیان — یہ سُن کے ان کی باتوں کو روتے تھے انس وجان
کرتے تھے ہر چہار طرف نالۂ و فغان — پھر سر اٹھا خطاب کیا سوئے آسمان
اے چرخ غافلی کہ چہ بیداد کردۂ — وزکین چہا درین ستم آباد کردۂ

کھویین نے یزید نبی کے من کو چین
جالم تیرے ہاتھ سون پیاسا گیو حسین

ہر چند ذات حق ہے مبرا الم سے اب — کیا کام اُس جناب کو شادی و غم سے اب
مطلب نہ ضحک سے نہ غرض چشم نم سے اب — لیکن یہ ایک رمز ہے تم سن لو ہم سے اب
ہست از ملال گرچہ بری ذات ذوالجلال — او در دل ست و ہیچ دلی نیست بے ملال

سُن کے یہ غم یزید ہو پربت جائیں بھسم
چپ ہی رہ جائیں سودا آگے کچھ مت کہہ

سودا

(۲)

مضمون چند صرف زبان قلم کروں ‏ ہے جی میں آج سیف زبان کو قلم کروں
بولا قلم کہ میں سرِ تسلیم خم کروں ‏ چاہا جو میں کہ وصف سراپا رقم کروں
صانع نے جب کہ لوح پہ جاری قلم کیا
ماتھے کو لوح مصحفِ عارض رقم کیا

ہے گوشۂ کمان سے ملا گوشہ کمان ‏ بایکدگر اس ابروے پیوستہ کی یہ شان
آگاہ غافلوں کو ہے کرتا یہ نوجوان ‏ بیجا نہیں ہوا یہاں قوسین کا قران
نانا مرا گیا جو سوے آسمان تھا
اُس میں خدا میں فاصلۂ دو کمان تھا

قبضہ میں ہے ہر اک کے کمان سیاہ رنگ ‏ باہم ہیں ترک چشم صدا مستعد بجنگ
جو تودۂ فلک سے گزر جائے بید رنگ ‏ دونوں کے پاس ترکش مژگاں کے ہیں خدنگ
ہو کیوں نہ سر بلند یہ بینی جہان میں
باعث مصالحہ کا ہوئی درمیان میں

ہیں دونوں نون مقصد دونوں کن فکان ‏ بولے ہیں دونون ابرؤں کو شاعر جہاں
بینی اُسی طرح ہے میان دو رُخ عیان ‏ ہے جو الف میان جہان آفرین نہاں
رُخ پر عیان نہیں جو خطِ سبز فام ہے
کیا ترجمہ ہے مصحف ناطق کو کام ہے

مشتق یہ لام آیۂ واللیل سے ہوا ‏ لام اُس کے گیسوؤں کو لکھوں میں تو ہو بجا
حلقہ میں زلف کے جو یہ رخسار آگیا ‏ عارض ہیں دونوں معنی والشمس والضحیٰ
سب بول اُٹھے کہ داخل عقرب قمر ہوا
قاسم کو دیکھ لو نہ مبارک سفر ہوا

ہے عارضوں کو مثل مہ چاردہ کمال ‏ چودہ برس کا بھی نہیں ہووے گا سن و سال
دو بدر دونوں رُخ ہیں تو ابرو ہیں دو ہلال ‏ یہ ایک طور پر اُسے ہر مرتبہ زوال
اوج سپہر پر مہ و خورشید ماند ہیں
کیا منہ مقابلہ کا یہاں چار چاند ہیں

مژگان راست صانع قدرت کا ہے قلم ‏ ابرو کو نون پہلے میں ہوں کر گیا رقم

وہ نون یہ قلم جو مطابق ہوئے بہم — کیا حل ہوا ہے ترجمۂ نون والقلم

اس شکل کو جو روزِ نخستین رقم کیا
پہلے قلم نے سورۂ یوسف کو دم کیا

فرطِ غضب سے سرخ ہیں چشمانِ پُرخمار — یہ بیشک عینِ عقل شجاعت ہے آشکار
اس باغ میں ہنوز نہیں سبزہ کی بہار — کانوں کو دیکھ دیکھ کے گل کیوں نہ کھائے خار

وہ نازکی میں گل سے فزوں لاتعد ہوئے
کان ایسے آج تک تو نہیں گوش زد ہوئے

دانتوں کی مدح گو شعرا کر گئے ہیں سب — مدت کے بعد پھر یہ معمّا کھلا ہے اب
گویا جو اُس کے ہونے لگے سمجھنے میں لب — جاری ہوئی زباں سے پہلے ثنائے رب

عہدِ طفولیت میں ادا شکر کر دیا
مُنہ موتیوں سے صانعِ قدرت نے بھر دیا

غواصِ فکر چاہِ ذقن دیکھ کر — کہنے لگا یہ بحرِ لطافت کہ ہے بھنور
ہے صفحۂ بیاضِ گلو مطلعِ سحر — بیڑے چبائے ہیں جو شبِ عقد بیشتر

نازک ہے ایسی جلد بدن اِس جوان کی
سرخی گلے میں ہے وہی موجود پان کی

سینہ ہے اُس کا مخزنِ اسرارِ عدل و داد — بازو ہر ایک قوتِ بازوئے اعتقاد
اس نازکی و حُسن پہ لیکن دمِ جہاد — پنجہ درشت پنجۂ فولاد سے زیاد

نوشاہ کی ہر ایک جو اُنگلی حنائی ہے
سو شمعِ روشنِ حرمِ کبریائی ہے

دستِ حنائی پنجۂ مرجان سے ہم عنان — کنگنا وہ موتیوں کا کلائی کے درمیاں
حیرت ہے یہ کہ عقدِ ثریا ہے آسماں — دن کو قرینِ پنجۂ خورشید ہے عیاں

اعجازِ موسوی بھی ہے اس خاندان میں
دکھلا رہا ہے یدِ بیضا جہان میں

رتبہ بتاؤں اُس کمرِ راست کا میں کیا — ہے جس کے سامنے کمرِ آسمان دوتا
ثابت قدم ہو گیا کوئی اس سے سوا بھلا — روزِ ابد تلک نہ مٹے جس کا نقشِ پا

سُرمہ ہے اس کی خاک قدم حُور کے لئے
کفش اُس کی تاج ہے سرِ غفور کے لئے

تھی مطلع انوار جو پیشانی پر نور — نزدیک خرد ہم سبقِ روشنی طور
کیا رُتبۂ رُخسار مخطط کروں مذکور — بولے ورق سورۂ یوسف جسے جمہور
وہ دیدۂ حق بیں جو اس ابرو کے د رے تھے
دو طاق میں شیشے مئے عرفان کے دھرے تھے

بینی کی بلندی کا اشارہ تھا یہ ہر آن — ہر عضو سے اب جسم میں اونچی ہے مری شان
کان ایسے کہ جن کان کے ثانی نہیں امکان — لب ایسے عقیق یمنی جن پہ ہو قربان
بو سیب بہشتی کی تھی اُس سیب ذقن میں
دندان درِ نایاب تھے اُس درج دہن میں

میر ضمیر

۳

یہ کہہ کے سب نے اٹھایا جو ڈیوڑھی کا پردا — سواری کا علی اکبر کی دیکھا یہ نقشہ
کہ گھوڑے پہ ہے پڑی لاش اور باپ اس کا — رکھے اک ہاتھ کو اس پر پیادہ پا آیا
اور ایک ہاتھ کو وہ اپنے سر پہ مارے ہے
کہاں گئے علی اکبر یہی پکارے ہے

ڈھلکی آتی ہے گھوڑے کی باگ مٹی پر — سموں پہ شرم سے گھوڑا جھکائے آتا ہے سر
ایالِ زین ہے اکبر علی کی خون سے تر — لٹکتے ہاتھ ہیں لوہو بھرے ادھر اور اُدھر
لٹکتا سر بھی ہے اور پاؤں بھی لٹکتے ہیں
امام رو رو کے بیٹے کے مُنہ کو تکتے ہیں

سواری یوں علی اکبر کی جب نظر آئی — کلیجہ تھام کے ہاتھوں سے بانو چلائی
مجھے تو کچھ نہیں اس وقت دیتا دکھلائی — مری تو چشم میں لوگو رہی نہ بینائی
جو تم نے دیکھا ہو اکبر کو مجھ کو دِکھلا دو
ملے تم اس سے ہو تو اب مجھے بھی ملوا دو

کہاں ہے لال مرا لاؤ پاس مجھ ماں کے — لگا لوں چھاتی سے پوتے کو بی بی زہرا کے
یہ کہہ رہی تھی کہ سبطِ رسول نے لا کے — لٹائی لاش بچھونے پہ سر کو ٹھہرا کے
پکاری زینب سرگشتہ پیٹ کر سر کو
سپاہ شام نے جانے دیا نہ اکبر کو

یہ شکل چاند سی لہو میں بھر گئی ہے ہے — وہ شان اور وہ شوکت کدھر گئی ہے ہے
جگر سے اس کے سناں یوں گذر گئی ہے ہے — پھپھی بھتیجے کے بدلے نہ مر گئی ہے ہے
یہ مرنے والا مری آنکھوں کا اجالا تھا
چھٹی کے روز اُسے میں نے لے کے پالا تھا

یہ مجھ غریب کا بیٹا تھا خلق میں مشہور — نہ قدر بیٹوں کی ہرگز مجھے تھی اسکے حضور
یہ نور دیدۂ سبطِ رسولؐ ربِ غفور — وہ مشتِ خاک کہاں اور کہاں خدا کا نور
یہ چاہتی تھی میں اس مرنے والے دلبر کو
کہ چھاتی سے نہ لگاتی تھی عون و جعفر کو

یہ مُنہ جو لوہو سے اس دم بھرا ہوا ہے تمام — اسے دُھلاتی تھی میں اُٹھ کے ہر سحر کو مدام
یہ ہاتھ چھاتی کے سوراخ پر ہے جس کا مقام — اسی سے جھک کے کیا کرتا تھا یہ مجھ کو سلام
یہ وہ ہے خلق حسن کے تھے سب عیاں جس میں
نبی کی شکل تھی حیدر کا زور تھا اس میں

بھری لہو سے یہ اس کی بلند پیشانی — اٹے ہیں خاک سے گیسو بصد پریشانی
اٹھی جہان سے نبیؐ کی شبیہ نورانی — گیا یہ لال ترستا جہاں سے بن پانی
ردائے خون میں قضا نے اسے لپیٹا ہے
موا یہ دشتِ ولایت کا شیر بیٹا ہے

یہ کہہ کے پیٹ کے سر کو پچھاڑ جو کھائی — پکاری بانو کو اکبر تمہاری لاش آئی
جواب دو مجھے قربان ہووے یہ دائی — میں دیکھوں برچھی کلیجہ پہ کس جگہ کھائی
گئے تھے اچھے اور آئے لہو لہان ہوئے
اسی لڑائی کی خاطر تھے تم جوان ہوئے

میر خلیق

۴

تلوار

اللہ رے آمد آمدِ شمشیرِ دو زبان | ششدر تھے چار لاکھ کہ کیا شئے ہے الاماں
جنبش نہ ہاتھ میں تھی نہ تیغوں کے درمیان | مسلول کے پنجے میں ہوں جیسے چھ انگلیاں
ضرب اک طرف کہ ملئے میں اس کے مقرنہ تھا
قبروں میں ایک مردے کی گردن پہ سر نہ تھا

اس سے الجھ گئی کبھی اس سے الجھ گئی | برش نئی، صفائی نئی کجبرخی نئی
اک سرے لگ چلی تو الگ سر ہوئے کئی | گہ زرد، گہ سفید ہوا چرخِ سرمئی
بھاگے ہوؤں کو ضرب پہ لاتی تھی گھیر کر
دو کرتی تھی اڑی ہوئی رنگت کو پھیر کر

گہ ہمدمئی صورِ سرافیل کرتی تھی | گاہے عیادت پرِ جبریل کرتی تھی
گہ برجِ مہر و ماہ میں تحویل کرتی تھی | برش زیادہ چلنے میں تعجیل کرتی تھی
محوِ نظارہ مردمِ نظارہ ہو گئے
قطبِ سپہر، اخترِ سیارہ ہو گئے

ہر سو تھا شور تیغ کا کچھ اور ڈھنگ ہے | قالب میں تیرتی ہے مگر یہ نہنگ ہے
داخل میانِ خانۂ دل بے درنگ ہے | رن کی قسم یہ تیغ بڑی خانہ جنگ ہے
حق تو یہ ہے کہ مسئلہ دانِ تیغ شاہ ہے
سر چڑھ کے سب سے لڑتی ہے اور بیگناہ ہے

کہتی تھی بار بار قضا کیا ہے؟ میں ہوں میں | طوفانِ حشر و قہر و بلا کیا ہے! میں ہوں میں
دوزخ۔ سقر، عذابِ خدا کیا ہے؟ میں ہوں میں | راہِ عدم و دیارِ فنا کیا ہے؟ میں ہوں میں
حق سے ڈرو تو مژدۂ فضلِ الٰہ ہے
توبہ کرو تو قبضہ میں میرے پناہ ہے

یاں سب کو تھا یقین کہ وہاں تھی یہیں نہ تھی | واں اتفاق تھا کہ یہاں تھی یہیں نہ تھی
ہر جا تھی اور پوچھو کہاں تھی کہیں نہ تھی | لاکھوں کے قتل کرنے کو ہاں تھی، نہیں نہ تھی

اس برق ذوالفقار کے جلوے کہاں نہ تھے
واں تھے جہاں زمین نہ تھی آسمان نہ تھے

قالب کی یہ تو دشمن جاں تھی دم نگاہ
قطع نظر بدن سے نگہ کو نہ تھی پناہ
دعوے کے صدق کے لئے حجت تھی نہ گواہ
سن لو دلیل قطعی اگر ہو کچھ اشتباہ
آیا نظر نہ رتبۂ مولا سپاہ کو
تیغ علیؓ نے قطع کیا تھا نگاہ کو

دل کر چلی فلک سے تو بجلی جدا ہوئی
تڑپی بزیر خاک تو مچھلی ہوا ہوئی
چمکی جو خود سر تو قیامت بپا ہوئی
روشن ہوئی جو سینے پہ جوشن قبا ہوئی
کھولے زرہ کے ایک نظر میں ہزار بند
کاٹے ہزار طرح سے عنصر کے چار بند

بے نام و بے نشان تھا ہر اک پہلواں کا اسم
تقسیم ضرب سے رہی باقی نہ کوئی قسم
سائے کی شکل سر پہ چراتی تھی اپنا جسم
یہ تیغ کے ہنر تھے کہ جادو تھے یا طلسم
دل رخنہ رخنہ کر کے زرہ کو اڑا دیا
طائر کو جال، جال کو طائر بنا دیا

خوں موجزن تھا تیغ کی گرمی سے تھا یہ حال
شبنم کا جیسے صبح کو خورشید سے زوال
جب یہ کڑی ہوئی تو زرہ ہو گئی نڈھال
فولاد بہ گیا عرق شرم کی مثال
جی پر بنی زرہ کی جو صورت بگڑ گئی
کیا دن دہاڑے دشمنوں پر اوس پڑ گئی

طاؤس فلک سیر دم جلوہ گری تھا
بو گل میں تو گلشن میں نسیم سحری تھا
صیحہ سے عیاں قہقہۂ کبک دری تھا
آہو تھا چرندوں میں پرندوں میں پری تھا
کاوے کی ثنا کیجئے دل اس پہ تلا ہے
دریا سے کوئی عقدۂ گرداب کھلا ہے

غل تھا چکور آگ کو کھا کر نکل گیا
مرکب کا جگر چیر کے راکب نکل گیا
بے روح ہوا دل جو وہ پیک اجل گیا
سینے کا لہو بہ کے جو گردن میں ڈھل گیا
بے جان و جگر قلب بہم رہ گئے باقی

طاؤس اُڑا نقش قدم رہ گئے باقی

چمکی، گری، اٹھی، ادھر آئی اُدھر گئی   خالی کئے پرے تو صفیں خوں سے بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی   ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اُتر گئی
غل رن میں تھا یہ کیا ہے جو قہرِ صمد نہیں
ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں

بجلی گری کہ فوج پہ تیغ دوسر گری   کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ کبھی فرق پر گری   سر کاٹ کر ادھر سے اُٹھی جو اُدھر گری
زِرہیں تنوں میں مثلِ کفن چاک ہوگئیں
اک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہوگئیں

اک شور تھا کہ تیغ ہے یا ہے خدا کا قہر   بہتی ہے جس کی آگ سے کوسوں لہو کی نہر
ناگن وہ ہے کہ کاٹے کی جس کے نہیں ہے لہر   اُتری گلے کہ چڑھ گیا سارے بدن میں زہر
زخموں سے جگر در سے کلیجے فگار ہیں
جوہر نہیں ہیں تیغ میں دندانِ مار ہیں

یکتا برش میں جوہرِ ذاتی میں قدر میں   چمکی اُحد میں خیبر و خندق میں بدر میں
تیزی رہی تھی سان کی آشوب و غدر میں   بڑھ کر سپر سے سر میں گئی سر سے صدر میں
کھنچتے ہوئے سپر سے نیا رنگ ڈھنگ تھا
راکب تھا نہ فرس تھا نہ زین تھا نہ تنگ تھا

غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی یہ گری   برچھی سے اُڑ گئے وہ سنان یہ گرہ گری
ترکش کٹا، کمان کیانی کی رہ گری   یہ سر اُڑا، وہ خود اُڑا، یہ زرہ گری
آتی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح
گرتی ہے برقِ قہرِ الٰہی اسی طرح

سر لوٹتے تھے برچھیوں والوں کے ہر طرف   ٹکڑے پڑے تھے دشت میں بھالوں کے ہر طرف
پامال تھے سوار رسالوں کے ہر طرف   پرکالے اُڑتے پھرتے تھے ڈھالوں کے ہر طرف
خاطر نشاں نہ تھی کسی آفت نشان کی
انبار تھیں کٹی ہوئیں شاخیں کمان کی

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے　　تنی تھی بس تنوں سے زین پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پئیے ہوئے تھے گھاٹ گھاٹ کے　　دم اور بڑھ گیا تھا۔ لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانئے ملا تھا مزا کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

ہر ہاتھ میں اُڑا کے کلائی۔ نکل گئی　　کوندی، گری زمین میں سمائی۔ نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی۔ نکل گئی　　مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی۔ نکل گئی
چار آئینہ کے پاس تھی۔ اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے فاک پر　　پنجوں سے ہاتھ شانوں سے بازو تنوں سے سر
قبضہ سے تیغ برسے زرہ ہاتھ سے سپر　　برچھی سے پھل کمان سے زرہ زین سے تبر
ترکش کہیں پڑے تھے نشان زری کہیں
پیکان کہیں تھے پشت کہیں تھی سری کہیں

جب صف پہ وار کرتے تھے سلطان بحر و بر　　اُڑتی تھی کٹ کے صورت کاغذ ہر ایک پر
چھپتی تھیں بھاگی جاتی تھیں گرتے تھے فاک پر　　قبضوں سے تیغیں جسم سے روحیں تنوں سے سر
شل تھے قدم گریز کے کوچے بھی بند تھے
شعلہ وہ تیغ تھی سرِ اعدا سپند تھے

چھپتے تھے یوں وہ دیکھ کے اُس تیغ کی چمک　　بھاگے شعاعِ مہر سے جس طرح شپرک
اوج سما سے زلزلہ برپا تھا تا سمک　　چمکی وہ جب تو کانپ گئے چرخ پر ملک
ہر شئے تھی خوفِ جان سے خضوع و خشوع میں
سجدے میں تھی زمیں تو فلک تھا رکوع میں

چم خم وہ تیغ کا تھا وہ کاٹ اور وہ آب و تاب　　آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کے شکم پر کہ اس کی تاب　　تیزی زبان میں وہ کہ فرشتوں کو دے جواب
جوہر سے اس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی تھی خونِ فوج کی اور آبدار بھی　　غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی

بجلی بھی ابرِ تر بھی خزاں بھی بہار بھی — تلوار بھی چھری بھی سپر بھی کٹار بھی
پانی نے اس کے آگ لگا دی زمانے میں
اک آفتِ جہاں تھی لگانے بجھانے میں

نیزوں کے بند بند قلم برچھیاں دو نیم — مثلِ قلم زباں درازِ سناں دو نیم
چار آئینہ کٹے ہوئے گرز گراں دو نیم — مغفر سے تا کمر؟ پہلواں دو نیم
سالم تھا پیش آئینہ تیغ جو دو نہ تھا
لشکر میں کون تھا وہی یکتا جو دو نہ تھا

وہ تیغ جب بڑھی صفِ کفار ہٹ گئی — چمکی جو برق ڈھالوں کی بدلی سمٹ گئی
دم بھر میں یوں صفوں کو الٹ کر پلٹ گئی — ان کی زمین لہو کے ڈریروں سے کٹ گئی
دریا کا آب تیغ سے بے آبرو ہوا
غل تھا کہ لو فرات کا پانی لہو ہوا

اک آگ سی تھی چار طرف شعلہ فشاں برق — وہ برق کہ خود مانگتی تھی اس سے اماں برق
یاں موج تو واں سیل جو یاں ابر تو واں برق — منہ زہر برقِ قہر بدن آگ زباں برق
سرکش تھا جو ناری یہ جلاتی تھی اسی کو
لوہے پہ بھی گرتی تھی تو کھاتی تھی اسی کو

اٹھکر کبھی ٹھیری کبھی لپکی کبھی چمکی — سر گر گئے گردن جدھر اس تیغ نے خم کی
سیدھی صفِ دشمن کو ملی راہ عدم کی — سیفی تھی کہ گویا دمِ شمشیر پہ دم کی
دم بھر میں صفیں صاف تھیں بیداد گرونکی
تھی بینہ کی طرح خاک پہ بوچھار سرونکی

تھا صورت آئینہ تمام اس کا بدن صاف — خوں پیتی تھی پر دیکھو تو صاف دہن صاف
چلتی تھی جو سن سن تو نکلتا تھا سخن صاف — ہوں میں تو وہ جاروب کہ منہ کر دیتی ہوں رن صاف
نا اہل ہیں نامرد ہیں ناپاک ہیں اعدا
میں برقِ غضب ہوں خس و خاشاک ہیں عدا

چم خم سے ہلالِ فلک نیلوفری تھی — مارا تھا ہزاروں کو مگر خوں سے بری تھی
شوخی تھی نئی اور نئی جلوہ گری تھی — تھی تیغ کہ قبضہ میں سلیماں کے پری تھی

اک آگ لگی وار جدھر چل گیا اس کا
جو آگیا سایہ میں بدن جل گیا اس کا

گھوڑا

نازک مزاج نسترن اندام تیز رو
گردوں مسیر بادیہ پیما و برق دو
اس کا نہ اک قدم نہ زغندیں ہرن کی سو
دو روز سے نہ کاہ ملی تھی اسے نہ جو
رفتار میں ہوا تھا اشارے میں برق تھا
سرعت میں کچھ کمی نہ تھی چھل بل میں فرق تھا

سمٹا، جما، اڑا، ادھر آیا، ادھر گیا
چمکا، پھرا، جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اٹھ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند
سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند
سم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند
نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم سربلند
گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ اڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال
کبک دری خجل دل طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال
اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کے تھے کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا
آیا عرق تو ابر گہربار بن گیا
گہ قطب گاہ گنبد دوار بن گیا
نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا
حیران تھے اس کی گشت پہ لوگ اس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

انیسؔ

معرکہ جنگ

(۵)

اس عرصے میں حملے کیے مرحب نے دہان چار — پر ایک بھی اس بدبختی پر نہ لگا وار
آڑی ہوئی تلوار تو ظالم ہوا ناچار — بے کار ہوا اس کا ہر ایک بازوئے پیکار
تب تیغ کو جھنجھلا کے رخ پاک پہ کھینچا
تھرا کے یہ اٹھا تو الف خاک پہ کھینچا

تلوار جو عاری ہوئی حضرت کی سپر سے — ظالم نے لیا خنجر ہندی کو کمر سے
خنجر تو ادھر سے چلا تلوار ادھر سے — اس وقت ہوا آنہ سکی بیچ میں ڈر سے
اسوار کے سر پر جو پڑی ہانپ کے بیٹھا
تھرا کے یہ اٹھے تو فرس کانپ کے بیٹھا

اس تیغ نے سرکش کے ہو ترکش میں کیا گھر — غل تھا کہ گرا برج کبوتر میں وہ اژدر
پر تیروں کے کٹ کٹ کے گرے مثل کبوتر — ظالم ہوا مضطر صفت طائر بے پر
ناری نے نہ پھر تیرہ تلوار سنبھالی
ایک ہاتھ سے سر ایک سے دستار سنبھالی

اک وار میں اوس دست ستمگار کو کاٹا — خود و زرہ و بکتر خونخوار کو کاٹا
پرزے کیئے اسوار کے رہوار کو کاٹا — اک شور ہوا زور سے کہسار کو کاٹا
خرمن پہ جفاکار کے کیا آ گئی بجلی
یہ کوندی کہ بے پیر کو بس کھا گئی بجلی

بجلی گری بجلی پہ اجل آئی اجل پر — اک زلزلہ طاری ہوا گردوں کے محل پر
سیارے ہٹے کر کے نظر تیغ کی پھل پر — مریخ گرا شمس پہ اور شمس زحل پر
چہرہ نہ کیا سامنے سورج کی چمک نے
خود دانتوں سے تاروں کے زمین پکڑی فلک نے

غازی نے کہا بس اسی فن پر تجھے تھا ناز — سیکھا نہ یداللہیوں سے جنگ کا انداز
پھر کھینچی اس انداز سے تیغ شرر انداز — جو میان کے بھی منہ سے ذرا نکلی نہ آواز

خود و زرہ و بکتر و خونخوار و کو کاٹا
پرزے کئے اسوار کے رہوار کو کاٹا

خنجر کو جو کاٹا تو نہ ٹھہری وہ تبر پر — ٹھہری نہ سپر پر تو وہ سیدھی گئی سر پر
سیدھی گئی سر پر تو وہ تھی قلب و جگر پر — تھی قلب و جگر پر تو وہ تھی صدر و کمر پر
تھی صدر و کمر پر تو وہ تھی دامن زین پر
تھی دامن زین پر تو نہ گھوڑا تھا زمین پر

دو کرتی ہوئی گردن بے کیش سے نکلی — ارواح صفت جسم بداندیش سے نکلی
مچھلی کی طرح بازوے دلریش سے نکلی — آڑی کبھی ہو ہو کے پس و پیش سے نکلی
دم سینے میں کافر کے رکا اور یہ الگ تھی
دو ہو کے وہ دو سمت لڑا اور یہ الگ تھی

اس صف پر گری تیغ ستمگر اوسے مارا — سیدھی گری اوسپر تو الٹ کر اوسے مارا
ہٹ کر اوسے مارا تو پلٹ کر اوسے مارا — بڑھ کر اوسے مارا کبھی گھٹ کر اوسے مارا
اللہ رے صفائی کہ ذرا خون نہ بھرا تھا
یہ کاٹ کے نکلی بھی تو سر تن پہ دھرا تھا

دریا سے جو نکلا وہ یداللہ کا جانی — غل پڑ گیا وہ ابر کرم لے چلا پانی
سقائے سکینہ کی یہ کی مرتبہ دانی — بس آن کے سب ٹوٹ پڑے ظلم کے بانی
قبریں نبی و حیدر و زہرا کی ہلا دیں
سب برچھیوں کی نوکیں کلیجے سے ملا دیں

واحسرت دور دا کسی بے پیر نے آکر — اک گرز لگایا کہ جھکے خون میں نہا کر
یہ سانحہ دیکھا جو در خیمے پہ جا کر — زینب نے کہا ہاتھ سوئے قبلہ اٹھا کر
اے رب ہدا شہ کی فدائی کو بچانا
شہ نے کہا یا رب میرے بھائی کو بچانا

اک حشر ہوا کٹ گئے بازوے علمدار — گلرنگ ہوا سنبل گیسوے علمدار
ہنستے ہوئے آئے تھے عدو سوے علمدار — ٹکڑے ہوئے آئینہ پہلوے علمدار
تھے شیر ترائی کی طرف پھر پڑے عباس

یا حیدر کرار کہا گر پڑے عباسؑ

طلوع سحر

جب سرنگوں ہوا علم کہکشاں شب ۔۔۔ خورشید کے نشاں نے مٹایا نشاں شب
تیر شہاب سے ہوئی خالی کمان شب ۔۔۔ تانی نہ پھر شعاع قمر نے سنان شب
آئی سحر جو زیور جنگی سنوار کے
سب نے سپر ستاروں کی رکھ دی اتار کے

شمشیر مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب ۔۔۔ پھر تیغ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب
تھا بسکہ گرم خنجر بیضائے آفتاب ۔۔۔ باقی رہا نہ چشمہ نیلوفری میں آب
محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

تھی جوش خون کے عارضہ میں مبتلا شفق ۔۔۔ فصاد صبح آیا لیے نشتر و طبق
کھولی شفق کی فصد تو رنگ افق تھا فق ۔۔۔ گل رنگ تھا صحیفۂ گردوں ورق ورق
خون شفق میں سرخ قضا نے قلم کیا
اور خط و خال روز شہادت رقم کیا

صرف نگاہ داشت ہوا شاہ خوش نہاد ۔۔۔ دفتر کشا نے کھول دیا دفتر مراد
چہرے پہ صبح کے جو کیا آب زر سے صاد ۔۔۔ کافور ہو گئی شب تاریک کی مداد
رتبہ سے سرفراز کیا آفتاب کو
عہدہ ہراولی کا دیا آفتاب کو

طغرا نویس روز نے پھر جس قدر لکھا ۔۔۔ وہ حرف حرف موجب حکم قدر لکھا
خورشید کو ہراول فوج سحر لکھا ۔۔۔ حر کو ہراول شہ والا گہر لکھا
چہرہ تو دو ہراولوں کا ایک جا ہوا
پر حر کا نام مہر سے روشن سوا ہوا

شب نے نکالا پنبہ اختر جو کان سے ۔۔۔ غل نوبت سحر کا سنا آسماں سے

اور شور کوس رحلت سرور جہان سے فریاد واحسین حرم کی زبان سے
نعرہ سنا اذان کا خیام امام سے
اور اقتلوالحسین کا غل فوج شام سے

چاروں طرف تھا بسکہ ہجوم سیاہ شام گویا سیاہ پوش تھا آب روان تمام
ماتم یہ تھا کہ مالک کوثر ہے تشنہ کام بالکل اُلٹ دیے تھے حبابوں نے اپنے جام
منہ پر طمانچے مارتا تھا دست سوج سے
دریا جو دور پیاس میں تھا تشنہ کی فوج سے
دنیا میں اس جمال کا انسان نہ ہویگا یہ حور کا بھی چہرۂ تاباں نہ ہویگا
ہرگز یہ حسن یوسفؑ کنعاں نہ ہویگا یہ لب یہ رخ یہ چاہ زنخدان نہ ہویگا
قرباں گل رخان علیؑ و بتولؑ پر
اس حسن کا ہے خاتمہ آلِ رسولؑ پر دبیر

سراپا

(۶)

قامت حدیقۂ حسنی کا نہال ہے شمشاد مثل سبزۂ جہاں پائمال ہے
خوش قامتی کا سرو کو بے جا خیال ہے قمری بتا تو اس کی بھی ایسی ہی چال ہے
یہ کس کے سروقد کو صنوبر پہ فوق ہے
گردن میں تیری کس کی غلامی کا طوق ہے
سرلوحۂ بیاض صباحت ہے یہ جبین صادق ہیں ہم کہ صبح سعادت ہے یہ جبین
خورشید آسماں لطافت ہے یہ جبیں حقا کہ حق کے نور کی آیت ہے یہ جبیں
واضح ہے اس دلیل میں جائے سخن نہیں
لہریں ہیں بحر حسن کی چین و شکن نہیں
اس بھولی بھالی شکل کی کیا کیجیے ثنا جاگا ہوا وہ رات کا دولھا نیا بنا
چھائی ہوئی وہ آنکھوں میں نینداور وہ جھپنا اس عمر میں یہ عزم کہ ہو جائیے فنا

ہر زخم تیغ جسم پہ رنگین ہو پھول سے
باغ ارم سلامی ہیں کہیے بتول ع سے

ابرو کی وہ کمان وہ نکیلے مژہ کے تیر — قربان ہیں راستی و کجی پر جوان و پیر
قہر خدا ہے برہمی چشم بے نظیر — آہو ہے مردمک مگر آہوے شیر گیر
پایا ہے ارث رعب نظر بوتراب ع سے
آنکھیں اسد چراتا ہے ان کے عتاب سے

رخ صاف صاف آئینہ رحمت ودود — سبزے کا ہے نشان نہ ابھی خال کی نمود
گیسوے مشک بو پہ تصدق عبیر و عود — سونگھے یہ بو تو یوسف ع کنعان پڑھے درود
دیکھی ہے کس نے ایسی سواری جلوس کی
کوسوں مہک ہوا میں ہے عطر عروس کی

نازک دہن ہے غنچہ گل سے زیادہ تر — دندان برنگ گوہر شبنم ہیں جلوہ گر
خوں ہے لبوں کے رشک سے یاقوت کا جگر — دل کب کھلے عقیق یمن باندھیے اگر
کہیے جو لعل پستی اوج کلام ہے
وہ بھی شہید عشق لب سرخ فام ہے

یہ لب نتیجہ لب عیسیٰ دکھاتے ہیں — سو سو برس کے مردوں کو دم میں جلاتے ہیں
پریوں میں جان آتی ہے جب مسکراتے ہیں — برگ گل ریاض ارم خار کھلتے ہیں
پھلتے ہیں نخل بے ثمر ان کے بیان سے
جھڑتے ہیں پھول وقت تکلم زبان سے

لکھتا ہے کلک چاہ زنخدان کی آب و تاب — کیونکر نہ حرف حرف پہ منہ میں بھر آئے آب
اس چاہ سے ہے چشمۂ خورشید کو حجاب — قطرے عرق کے بنتے ہیں یاں غیرت گلاب
آب حیات اسی میں ہے خالق گواہ ہے
ڈوبا ہے جس میں خضر کا دل یہ وہ چاہ ہے

ہے گردن و گلو سے عیاں عز و شان حسن — رہتا ہے سر بلند انہیں سے نشان حسن
وہ شمع حسن یہ قمر آسمان حسن — وہ روح حسن ابن حسن ع ہے یہ جان حسن
کہتی ہے چشم اس کی صفائی نظر میں ہے

تار نظر گلے ہیں کہ رشتہ گہر میں ہے

شانے بھرے بھرے ہیں تو بازو ہیں صاف صاف
گلدستہ باندھنا ہے انہیں عقل کے خلاف
کہنی تک آستین جو چڑھی ہے پئے مصاف
ساعد میاں ہے صورت شمشیر بے غلاف
آواز آرہی ہے یہ پستی و اوج سے
نکلی ہے مچھلی حسن کے دریا کی موج سے

دست حنائی وہ کہ شفق جس سے رشک کھائے
رنگیں یہ ہاتھ حور بہشتی نے بھی نہ پائے
کیونکر نہ بحر شرم و خجالت میں ڈوب جائے
ایسی کلائی پنجۂ مرجان کہاں سے لائے
کنگنا ہلا تو دشت کبھی سارا چمک گیا
گویا شفق میں صبح کا تارا چمک گیا

سینہ وہ آئینہ ہے کہ جس کی نظر پڑی
آنکھ اس کی آفتاب جہانتاب سے لڑی
خود حسن دیکھتا ہے منہ اپنا گھڑی گھڑی
روشن ہے پرتو سے زرہ کی ہر اک کڑی
سادہ لباس سمجھو نہ اس رشک ماہ کا
خلعت ستارہ دار ہے دولھا کے بیاہ کا

افراط نازکی سے کمر بے مثال ہے
یاں معترف قصور پہ چشم خیال ہے
تہمت یہ باندھنا ہی جو کہتے ہیں بال ہے
جان ہے سو جان کا نظر آنا محال ہے
پائینگے جاگتے میں نہ اس کو نہ خواب میں
باریک بین بھی رہتے ہیں یاں پیچ و تاب میں

یہ پائے نازنین ہے صفائی میں بسکہ فرد
جس آئینے پہ تازہ جلا ہو وہ یاں ہو گرد
سرکائے رن سے گیا قدم اپنا وہ شیر مرد
پسپا جو لاکھ سے نہیں ہوتا دم نبرد
بچے ہیں خاندان شہ کائنات کے
پتلے بنے ہوئے ہیں سراپا ثبات کے

مرگِ فرزند

چھٹا جو شاہ سے پیری میں نوجوان فرزند
حسین سو خوش قد و خوش رو و خوش بیان فرزند

رشید و عابد و ذیجاہ و رتبہ دان فرزند　　پدر کے تن کی توان سارے گھر کی جان فرزند
بہار جس کی نہ دیکھی خزاں وہ باغ ہوا
قیامت آگئی گھر شمع کا بے چراغ ہوا
بدن سے جان چلی جسم تھر تھرانے لگا　　پسینہ آگیا جی شمع کا سنسنانے لگا
پسر جہاں سے چلا تن سے زور جانے لگا　　چلے جو رن کو تو ہر گام پر غش آنے لگا
کبھی اوٹھے تو کبھی کر کے آہ بیٹھ گئے
جگر میں درد یہ اوٹھا کہ شاہ بیٹھ گئے
اوٹھا جو درد پکارے یہ شہ کہاں ہے پسر　　ہزار حیف جئیں ہم جہاں سے جائے پسر
یہ کیا کہ ہم تلک آتی نہیں صدائے پسر　　پدر کی زیست کہاں جب نظر نہ آئے پسر
پسر کے داغ نے خنجر گلے پہ پھیرا ہے
چراغ جس میں نہ ہووے وہ گھر اندھیرا ہے
بہار سبزۂ خط کی نہ ہم کو دکھلائی　　جب آئے پھولنے پھلنے کے دن تو موت آئی
وہ رخ وہ نرگسی آنکھیں وہ ہے رعنائی　　وہ گل سا جسم وہ تن پر قبا کی زیبائی
ہوا نہ بیاہ کہ چھوڑا جہان فانی کو
اجل نے لوٹ لیا گلشن جوانی کو
کبھی تو دل کبھی ہاتھوں سے تھامتے تھے جگر　　اوٹھا نہ جاتا تھا مطلق یہ جھک گئی تھی کمر
بشکل حضرت یعقوب کہتے تھے رو کر　　کدھر گئے میرے یوسف لقا علی اکبر
جو تھا عصائے ضعیفی وہ چھٹ گیا ہے ہے
پسر شہید ہوا باپ لٹ گیا ہے ہے
خبر نہیں کہ تڑپتے ہو تم کہاں بیٹا　　ہماری آنکھوں میں اندھیر ہے جہاں بیٹا
جدا نہ ہو کسی ماں باپ سے جواں بیٹا　　پدر پہ ٹوٹ پڑا غم کا آسماں بیٹا
یہ داغ عالم پیری میں دے گئے ہم کو
گلا یہ ہے کہ نہ تم ساتھ لے گئے ہم کو
اکیلا دلبر زہرا کو رن میں چھوڑ گئے　　مدد کا وقت جب آیا تو منہ کو موڑ گئے
پھر آکے باپ کے آگے نہ ہاتھ جوڑ گئے　　سفر میں باپ کی بیٹا کمر کو توڑ گئے

ہوئی تمام نہ منزل کہ ہاتھ چھوڑ دیا
ضعیف باپ کا جنگل میں ساتھ چھوڑ دیا

ہزار حیف جوان ہو کے مر گئے بیٹا　　پتا تو ہم کو بتاؤ کدھر گئے بیٹا
پدر سے روٹھ کے دادی کے گھر گئے بیٹا　　جہاں میں باپ کو ویران کر گئے بیٹا
بسایا دشت کو خالق نے جب جوان کیا
ہمارے گھر کی نباہی کا کچھ نہ دھیان کیا

ابھی تو رن سے تم آتے تھے پاس بابا کے　　ابھی تو ہوتے تھے صدقے تم اپنی زہرا کے
ابھی میں روتا تھا چھاتی سے تمکو لپٹا کے　　ابھی یہ کہتے تھے سوکھی زباں دکھلا کے
کلیجہ پیاس کی شدت سے آہ جلتا ہے
پلا دو تھوڑا سا پانی کہ دم نکلتا ہے

ابھی تو لیتا تھا میں بوسۂ لب و دنداں　　ابھی تو باپ نے دی تھی تمہارے منہ میں زباں
ابھی یہ کہتے تھے رو کر کہ ہائے بابا جان　　مرے دہن سے بھی ہے خشک آپکا تو دہاں
ابھی تو میں نے دعا پڑھ کے تم پہ دم کی تھی
ابھی تو منہ میں انگوٹھی رسول کی دی تھی

اب آنکر نہیں سوکھی زبان دکھلاتے　　ہماری پیاس پہ تم اشک بھر نہیں لاتے
اکیلے پھرتے ہیں جنگل میں ٹھوکریں کھاتے　　گلے سے باپ کے آکر لپٹ نہیں جاتے
خفا ہو کچھ جو بلاتے نہیں ہو بابا کو
صدا بھی اپنی سناتے نہیں ہو بابا کو

یہ بین کرتے ہوئے رن میں پہنچے جب شہ دیں　　تلاش کی پر نہ بیٹے کی لاش پائی کہیں
ستمگروں کو پکارے کہ دل کو تاب نہیں　　بتاؤ جلد کہاں ہے ہمارا ماہ جبیں
پدر کی گود کے پالے کو کیا کیا تم نے
ہمارے گیسوؤں والے کو کیا کیا تم نے

علی کے لال کا پیارا کہاں سدھارا ہے　　ہماری آنکھوں کا تارا کہاں سدھارا ہے
بتاؤ لال ہمارا کہاں سدھارا ہے　　وہ بھوک پیاس کا مارا کہاں سدھارا ہے
جری دلیر کو جنگل میں کس نے مارا ہے

ہمارے شیر کو جنگل میں کس نے مارا ہے
ہمارے یوسف ثانی کو جلد بتلاؤ رسول حق کی نشانی کو جلد بتلاؤ
گل ریاض جوانی کو جلد بتلاؤ ستمگرو میرے جانی کو جلد بتلاؤ
دل حسین پہ اب ابر غم کا چھایا ہے
ہمارے چاند کو بادل میں کیوں چھپایا ہے
بتاؤ جلد وہ نخل ریاض دین ہے کہاں ہے دن دہاڑے اندھیرا وہ مہ جبیں ہے کہاں
علی کے لال کی آغوش کا مکیں ہے کہاں دہن میں جس کے انگوٹھی تھی وہ نگیں ہے کہاں
فراق میں دل مضطر نہ چین لیویگا
تمہیں سے لال کو اپنے حسین لیویگا

گھوڑے کی تعریف

وہ تیزیاں وہ گشت وہ سرعت سمند کی وہ پیش وہ پس وہ شان وہ شوکت سمند کی
وہ بال وہ جمال وہ صورت سمند کی نازک وہ جلد صاف وہ رنگت سمند کی
بکھرے جو عکس گیسوئے عنبر فشاں پڑے
لگ جائے پھول بھی تو بدن پر نشاں پڑے
قربان سیاہ آنکھوں پہ آہو اتار کے نافو نکو پھینکو بال پہ صدقے اتار کے
جھپٹے اگر چڑھے ہوئے نتھنوں کو مار کے بھاگیں گوزن شیر ہرن ہون کچھار کے
چوما ہے دشت ظلم درختوں کی آڑ کا
ٹاپوں سے کانپتا ہے کلیجہ پہاڑ کا
وہ گشت وہ قدم وہ طرارے وہ آڑ جاؤ صدقے ہوں ایسی ہیکل زریں پہ سو بناؤ
آجائے نیند پاؤ قدم میں وہ لطف پاؤ جب چاہو سیر عالم امکا کی دیکھ آؤ
کھوے گا اس کے سامنے کیا شاہ باز پر
پانی نشیب میں تو ہوا ہے فراز پر
کلغی فرس کے سر پہ جو تھی بے بدل لگی پلٹا سمٹ کے جب تو بڑ دکفل لگی

الف انکول سی

قینچی کبھی لگی نہ چھری بے محل لگی   چھیڑا ذرا تو پشت کے مہروں میں کل لگی
راکب کے گدگدانے سے بے تاب ہو گیا
کیا آگ تھا مزاج کہ سیماب ہو گیا

روکی پہنچ کے باگ جو اس شہسوار نے   نیزہ زمین پہ گاڑ دیا نامدار نے
کانٹے بہارے دشت کے بادبہار نے   تعظیم کی زمین سے اٹھ کر بہار نے
دیکھا جو آفتاب فلک احتشام کو
علموں نے ہاتھ اُٹھائے برابر اسلام کو

میر مونس

ازرق پہلوان اور حضرت قاسم کا مقابلہ

(۷)

صدا یہ دلبر شبر نے دی کہ اب بے دیں   زمیں سے چاروں کے مردے اٹھائیگا کہ نہیں
اب آ دلیر سے لڑنے کو او شقی و لعیں   جہاں بسر ہیں ترے بھیجدیں تجھے بھی وہیں
یہ دیر تشنہ دہانوں پہ شاق ہے اب تو
وغا کا تجھ سے ہمیں اشتیاق ہے اب تو

چلے حسام زباں کے جو وار پھر دو چار   خفیف اور ہوا دل میں ازرق غدار
چڑھا فرس پہ جفا جو سجے ہوئے ہتھیار   چلا وہیں سے وہ سرکش علم کئے تلوار
مثال گرگ یمین و یسار تکتا تھا
نظر سے قہر تو آنکھوں سے خون ٹپکتا تھا

سیاہ قلب فساد و عناد پر سرگرم   حیا نہ آنکھ میں ذرہ نہ مطلقاً آزرم
شقی شریر جفاکیش سنگدل بے شرم   وہ استخواں کہ ہے فولاد جسکے سامنے نرم
کسی کو روم میں اور شام میں نہ مانتا تھا
وہ اپنے زعم میں رستم کو زال جانتا تھا

وہ نحس و بد کہ ڈرے جس کا سایہ دیکھ کے یم   وہ تیرہ رنگ کہ جس سے سواد شام ہو دم

گر یز دیو بھی جس سے کرے وہ جثۂ شوم — سیہ کلائی تھی یا پیل مست کی خرطوم
گڑھے زمیں پہ ہوں جس جا یہ بے ادب جائے
وہ قد کا بار کہ جس سے پہاڑ دب جائے
وہ عضو عضو کی سختی وہ فربہی تن کی — نہ جس کے سامنے کچھ اصل تھی تہمتن کی
وہ چار آئینہ کڑیاں کڑی وہ جوشن کی — وہ دوش نحس و نجس پر سپر گئی من کی
وہ تیغ جس کا نہ لنگر ہزار سے اٹھے
وہ نیزہ جو کہ نہ اسفندیار سے اٹھے
تنی ہوئی تھیں رگیں اس طرح سے گردن کی — عیاں تھا یہ کہ سلاخیں گھڑی ہیں آہن کی
تھا درہ کوہ کا چوڑان صدر دشمن کی — فرس نے جست جو کی ہل گئی زمین رن کی
عقب میں اس کے جو پل جمع تھے گرجنے لگے
ادھر سپاہ میں طنبور و طبل بجنے لگے
مقابلہ کو بڑے طنطنے سے آ پہونچا — اکڑ کے سامنے غازی کے بے حیا پہونچا
اٹھائی تیغ دو دم دشمن خدا پہونچا — ملائے آنکھ قریں یہ اسد بھی جا پہونچا
فلک پہ اڑ کے سمِ اسپ سے غبار چلا
جدل سے پہلے حسامِ نظر کا وار چلا
رجز کے بعد شقی مثلِ فیل چنگھاڑا — اٹھا کے سر کبھی ترچھا ہوا کبھی آڑا
زمیں سے نیزہ اکھاڑا کبھی کبھی گاڑا — غبار راہ کو پونچھا کبھی کبھی جھاڑا
کبھی بڑھا تو کبھی پاؤں تھرتھرانے لگا
فرس پہ جھوم کے نوشاہ مسکرانے لگا
ڈریں یہ جس میں تو بادل کی طرح پھر گرجا — کہا کہ زور کا میرے ہے غلغلہ ہر جا
پہاڑ کو جو ہٹاؤں رہے نہ وہ بر جا — مرا ہے نامور دن میں بڑا ہوا درجا
مقابلہ مرا جس نے کیا وہ ہارا ہے
اسد کی اصل ہے کیا اژدروں کو مارا ہے
پکارا دلبر شبّر کہ تو عبث گرجا — ہماری تیغ کی بجلی کا شور ہے ہر جا
رہیں گے ہوش نہ ڈر سے مرے ترے برجا — یہ تیغ تیز کرے گی ترا بُرا درجا

کھلے ہوئے تری خاطر عدم کے رستے ہیں
زیادہ جو ہیں گرجتے وہ کم برستے ہیں

کہا شقی نے ڈریں جن جو میری تیغ چلے
پکڑ لوں شیر کی گردن اگر تو سانس نہ لے
جسے میں غیظ سے دیکھوں نہ موت سر سے ٹلے
جری وہ میں ہوں کہ کاٹے ہیں سینکڑوں کے گلے
دغا پہ مجھ سے کوئی پیل زور تل نہ سکا
کسی سے اک مرے نیزے کا بند کھل نہ سکا

پکارا بڑھ کے جگر بند سیدہ والا
زباں کو بند کر اب ہاتھ میں اٹھا بھالا
وہ میں ہوں ضیغم نر سب سے زور میں بالا
علیؓ کے شیروں نے آغوش میں جسے پالا
لہو بہا کے تجھے اب جہاں سے کھوتا ہوں
حسینؑ کا ہوں بھتیجا علیؓ کا پوتا ہوں

کسی سے شیر خدا کے پسر نہیں ڈرتے
شریر لاکھ کریں شور و شر نہیں ڈرتے
تعلیوں سے تری پُر جگر نہیں ڈرتے
سگوں کے بھونکنے سے شیر نر نہیں ڈرتے
ہماری ضرب سے حیراں فوج والے ہوئے
سگے یہ کس کے پڑے ہیں زباں نکالے ہوئے

بناکہ زیر کیا ہم نے فوج کو کیسا
نہ دیکھا ایک کو مضبوط تھا سنا جیسا
وہ چاروں جیسے تھے نامرد تو بھی ہے ویسا
رہیگا شور ہم اس پیاس میں لڑے ایسا
اسد کو زور میں کم وقت جنگ جانتے ہیں
ہم ایسے بودوں سے لڑنے کو ننگ جانتے ہیں

دغا کے جوش میں دو طرف کھنچی تلوار
سنبھل کے لیں سپریں ہاتھ اٹھے بڑھے رہوار
ادھر سے سب سمٹ آئے پیادہ و اسوار
چہار سمت ہے اک غلغلِ بگیر و بدار
مگر ہے ڈر بھی کہ ایسا نہ ہو کہ پسپا ہو
لڑی ہوئی ہیں نگاہیں کہ دیکھئے کیا ہو

کبھی ہے خود پہ یہ تیغ اور سپر پہ کبھی
ملی ہوئی ہے گلے سے کبھی کمر پہ کبھی
کبھی کلائی پہ ہے دوش فتنہ گر پہ کبھی
کبھی بغل کی طرف صدر اہل شر پہ کبھی
مجال و تاب نہیں آنکھ چار کرنے کی

شقی کو بار نہیں ملتی وار کرنے کی

چمک سے تیغ دودم کے کبھی جھجکتا ہے — کبھی زباں کبھی دست قوی ہمکتا ہے
کبھی ادھر تو کبھی اس طرف بھٹکتا ہے — جھجکا کے سر کبھی پچھلے قدم سرکتا ہے

امید فتح نہیں زندگی کی آس نہیں
ٹھکانے ہوش نہیں ہیں بجا حواس نہیں

بڑھا سنبھل کے ادھر پھر شقی و ظلم پسند — قریب آگیا شبدیز ماہ ہست کے زغند
وہ آیا بائیں طرف دست ظلم کر کے بلند — یہ آئے دہنی طرف شیر سے اڑا کے سمند

اسے نہیں جو دھیان تھا اس حد پہ آگیا ظالم
قدم فرس کے زکے زد پہ آگیا ظالم

لگائی تیغ دودم کہہ کے یا علیِ ولی — اڑا لعین کا سر نحس پھر نہ موت ٹلی
گلے سے کھنچ کے دوبارہ جو پھر کمر پہ چلی — دوپارہ ہو کے گرا دشمنِ خداد علی

غرور شیر نے بدمست کا نکال دیا
زمین پہ فیل کو چورنگ کر کے ڈال دیا

طلوع سحر

فراغ ماہ کو جب رات کے سفر سے ہوا — فروغ انجم تاباں نہاں نظر سے ہوا
تمام دہر منور رخ سحر سے ہوا — ظہور مہر میں شہر و دشت و در سے ہوا

وفور حسن سے چاروں طرف ضیا پھیلی
جہان میں روشنئ قدرت خدا پھیلی

وہ دور دور بیاض فلک وہ نور سحر — وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور وہ ظہور سحر
وہ گلشنوں میں نوا سنجئ طیور سحر — نقاب چہرے سے الٹے ہوئے وہ حور سحر

وہ نور حسن جو اپنا سماں دکھانے لگا
فلک پہ چاند خجالت سے منہ چھپانے لگا

ہر اک مشام کو خوشبوئی گل بساتی تھی — صبا جب آتی تھی پھولوں میں بس کے جاتی تھی

فضائے صحن چمن خوبیاں دکھاتی تھی — دلوں کو وجد میں تازہ بہار لاتی تھی
نمود قطرۂ شبنم نہ تھے وہ گلشن میں
بھرے تھے دُرِّ فصاحت گلوں کے دامن میں

مہک رہے تھے ادھر تازہ پھول وقت نگاہ — چہک رہے تھے ادھر طائران حق آگاہ
گلوں کے رخ سے نہ ہٹتی تھی بلبلوں کی نگاہ — شگوفہ باغ میں سب کج کئے تھے اپنی کلاہ
عیاں خوشی تھی ہر اک روئے گل کی رنگت سے
نہال پھولے سماتے نہ تھے مسرت سے

طرب سے باد سحر کی تھی چال مستانہ — گلوں سے ہجر کا کہتی تھی بلبل افسانہ
چراغ لالۂ تر کی صبا تھی پروانہ — بنا ہوا تھا چمن حسن سے پریخانہ
زمین دکھاتی تھی عالم سپہر اخضر کا
شجر کا سایہ نہ تھا فرش تھا مشجر کا

ہر ایک پھول کا گلشن میں ڈھنڈھا وہ رنگ — چمن تھا یا کہ خدیو بہار کا اورنگ
وہ صاف نہر کا پانی کہ جس سے آئنہ دنگ — وہ سرو جس میں کہ سب قامت نگار کا ڈھنگ
وہ گرد نخل کے گل سبز و زرد بکھرے ہوئے
ادا دکھاتے ہیں خوبان باغ بکھرے ہوئے

وہ نکہت گل سنبل جو دور تک جائے — بہار وہ کہ دلوں کو جو وجد میں لائے
گھنے درختوں کے وہ سب گھنے ہوئے سائے — وہ خوش تھے پیچھے سے جو جو تھے سیر کو آئے
نشاط کر چکے زیر درخت اوترے ہوئے
روانہ ہوتے تھے پریوں کے تخت اوترے ہوئے

خوش تھے قلب بعدوں کے اور قریبوں کے — خیال ہجر تھا نہ خوف کچھ رقیبوں کے
سرور اصل سے دل خوش تھے خوش نصیبوں کے — کنار و بوس گلوں سے وہ عندلیبوں کے
ملال و رنج بھی تھا درد نامرادی بھی
نیاز و ناز بھی تھا چہچہے بھی شادی بھی

ہر اک نہال پہ مرغان باغ کا وہ غل — صدا سے جنکی الم دل کا رفع ہو بالکل
ادھر تھے جلوہ نما چہرہائے لالہ و گل — ادھر سنوارنا تھا زلف پرشکن سنبل

وہ لطف تھا جو کہیں اور غیر ممکن تھا
سحر کے وقت کہیں رات اور کہیں دن تھا

چمن میں دیتے رہے اُڑ کے اِغباں پانی ۔۔۔ زمین پہ چاہ سے تھا ہر طرف رواں پانی
ہر ایک نخل کے تھالے میں تھا رواں پانی ۔۔۔ ہوا تھا آبروئے باغ و بوستاں پانی

فسردگی گئی جان آ گئی بحال ہوئے
سحر کو خرم و سیراب سب نہال ہوئے

چمن میں پھرتا تھا خنداں و شادماں گلچیں ۔۔۔ گلوں کے ڈھیر میں جائے کہاں کہاں گلچیں
کبھی نہاں تھا نہالوں میں گہ عیاں گلچیں ۔۔۔ ہر ایک پھول کو سمجھے ہوئے تھا جان گلچیں

نہ شاخ تر کوئی چھوٹی نہ اک بڑی ٹوٹے
یہ وہ ہیاں تھا نہ کسی گل کی پنکھڑی ٹوٹے

گھوڑے کی تعریف

درِ عجب شکوہ سے حاضر ہوا فرس ۔۔۔ ساکت نہ تھا جو صورت سیماب یک نفس
وہ سُم وہ دُم وہ بال وہ گردن وہ پیش و پس ۔۔۔ وہ تیز رو نہ جس سے چلے کچھ ہوا کا بس

خوشرو و شوخ چشم و جہاں سیر و خوشخرام
چھلکے نہ آب ہاتھ میں راکب کے گر ہو جام

خوشرو و شوخ چشم و جہاں سیر و خوشخرام ۔۔۔ چھلکے نہ آب ہاتھ میں راکب کے گر ہو جام
پیکِ خیال صبح سے دوڑے جو تا بہ شام ۔۔۔ پچھلے سموں کی گرد نہ پائے وہ تیز گام

ٹھہرے تو سر پہ فخر سمجھ کر ہما پھرے
تھک کر ہوا پھرے پہ نہ وہ بادپا پھرے

اللہ رے ترکِ تازی رخش براق دو ۔۔۔ وہ سُم وہ نعل چار قمر چار ماہ نو
وہ پنڈلیاں کہ حور کو آنکھوں میں جنکی ضو ۔۔۔ رد میں ہرن کی جست جو لے گیا گرد
وارفتگی تھی کبک کو حیرت غزال کو

رہ رہ کے دیکھتی تھی ہوا اس کی چال کو

وہ گشت وہ غضب کے طرارے وہ جست و خیز ۔۔۔ زلفِ پری سے یال دل آویز مشک بیز
پر خشم چشم صورتِ شیغم دم آستیز ۔۔۔ جولانیوں میں مرصرِ زفرفِ سے تند و تیز
دارفتگی تھی کبک کو حیرت غزال کو
رہ رہ کے دیکھتی تھی ہوا اس کی چال کو

بالنے اڑا کے رخش کو پہنچا جو وہ ہژبر ۔۔۔ سب یوں ہٹے ہوا سے سمٹتا ہے جیسے ابر
ہاتھوں نے شہسواروں کے چھوڑی عنانِ صبر ۔۔۔ ٹھہرا فرس کو روک کے شیر خدا کا ببر
آنکھیں پھرائیں نہر کی موجوں کو دیکھ کر
گردن ہلائی گھاٹ کی فوجوں کو دیکھ کر

چھایا جو رعبِ حضرتِ عباسِ نیک خو ۔۔۔ مضطر مثال موج ہوئی فوج کینہ جو
ریتی سے ایک شور اٹھا تا کنار جو ۔۔۔ اس سے وہی لڑے جسے کھوتی ہو آبرو
آیا نہیں یہ شبیر اجل سر پہ آئی ہے
عباس کی نبرد علیؑ کی لڑائی ہے

ہشیار مورچوں سے خبردار نہر سے ۔۔۔ آگے صفیں بڑھی رہیں دو چار نہر سے
آیا ہے پانی لینے یہ جرار نہر سے ۔۔۔ ہاں صفدرو سرکیو نہ زنہار نہر سے
پیاسا ہے غیظ میں ہے جری ہے دلیر ہے
ندی پہ آنہ جائے کہ شیروں کا شیر ہے

گو باجہ آستیں کو الٹ کر وہ شیر نر ۔۔۔ کانپے سرانِ فوج کے دل ہل گئے جگر
نعرہ کیا غضب میں کہ اے فوج بد گہر ۔۔۔ تم سے رکیں گے حیدرِ کرار کے پسر
یہ ہاتھ جس دغا میں بڑھے پھر رکے نہیں
تھی کونسی مہم جسے سر کر چکے نہیں۔

نفیس

تلوار کی تعریف

۸

دکھلا کے عاشقوں کو چھما چھم برس گئی　　آرام رم ہوا جو رما رم برس گئی
جم کر یہ جس پرے پہ دمادم برس گئی　　ساون کی تھی گھٹا کہ چھما چھم برس گئی
چھایا جو ابر تھا ڈالوں کا چھٹ گیا؟
ہیبت سے خون مورچہ والوں کا گھٹ گیا

زخموں کے خون کھلے جو یہ گلگوں قبا چلی　　دل لے گئی جدھر کو وہ نازک ادا چلی
دریا بہا لہو کا جو وہ بے بہا چلی　　آگے وہ برق بارقہ پیچھے قضا چلی
بہتے ہیں خاک و خون میں آئے سینکڑوں گلے
کیا چال تھی کہ جس پہ کئے سینکڑوں گلے

بنیاد و ظلم و جور گھاتی ہوئی پھری　　اعجاز اہل حق کا دکھاتی ہوئی پھری
دریا کنارے خون میں بہاتی ہوئی پھری　　طوفان قدم قدم پہ اٹھاتی ہوئی پھری
کانپی زمین چڑھا ہوا دریا اوتر گیا
آب دم جام گردن سے گزر گیا

وہ دم کس اوسکا وہ چم خم وہ آب و تاب　　آفت کی باڑھ قہر کا کاٹ اور غضب کی تاب
جس تاب سے کہ زہرۂ رستم ہو آب آب　　دریائے تیغ پر پل محشر بنا جواب
دریا چڑھا وہ خون کا کہ پیر اک ڈر گئے
تابو نکے پل پہ کہ بدنوں سے اوتر گئے

اک منہ کے دو منہ آئیں نظر وہ صفائے تیغ　　نا بین ہیں یا دو ابروے جنگ آزمائے تیغ
جوہر تھے یا کہ خندۂ دندان نمائے تیغ　　وہ چم خم اوسکا اور وہ نازک ادائے تیغ
اس غول پر گری کبھی اوس صف پہ جا گری
چل پھر کے جس پرے پہ گری برملا گری

اوج

جدید نظم

یہ صنف شاعری نئی روشنی کا پرتو ہے۔ شعرائے قدیم کے کلیات اس سے خالی نظر آتے ہیں۔ مثنوی اور غزل کے ضمن میں اس صنف کی جھلک نظر آجاتی ہے لیکن الگ اس کا وجود ناپید ہے۔ اگرچہ میر و غالب کی ایک آدھ نظم تلاش کرنے سے مل جاتی ہے۔ لیکن ایسی نظمیں تفنن طبع کے لئے کہی گئی تھیں۔ سب سے پہلے جہاں اس کا پودا پھوٹا وہ سرزمین پنجاب ہے۔ ۱۸۷۴ء میں مولٰنا محمد حسین صاحب آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا جو ہر مہینہ انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس میں اُردو شاعری کی توسیع کے لئے شاعری کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی گئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب انگریزی لٹریچر کا اچھا خاصا حصّہ ترجمے کے ذریعہ اردو میں آچکا تھا۔ اس پر اہل ذوق کی نظریں پڑیں اور ان کے طبائع میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہُوا کہ اردو شاعری کا قدیم انداز ان کی نظروں میں سبک نظر آنے لگا اس اثر کے ماتحت جدت پسند طبیعتیں مغربی انشاء پردازی کی طرف ڈھل پڑیں۔ اس وقت مولٰنا حالی بھی لاہور میں قیام پذیر تھے۔ یہ بھی ان جدت پسند مشاعروں میں شریک ہوتے اور نظمیں پڑھتے۔ برکھا رت۔ نشاط امید۔ حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف انہیں مشاعروں کی نظمیں ہیں۔ پروفیسر آزاد کی پہلی نظم "شام کی آمد اور رات کی کیفیت" اسی مشاعرہ کی یادگار ہے۔ الغرض جدید نظم آزاد، حالی اور کرنل ہالرائڈ کی رہین منت ہے۔

یوپی میں لسان العصر اکبرالہ آبادی اور پنجاب میں ترجمان حقیقت علامہ سر اقبال کی نواطرازیوں نے اس زمین کے قلابے آسمان سے ملادیئے اور اب تو اردو کے پشاور سے لے کرائس کی راس کماری تک دور جدید کی نظموں نے فضا کو رنگین بنا رکھا ہے انجمن ارباب علم پنجاب کے اصلاحی پروگرام کے ماتحت بے قافیہ نظموں اور ایسی نظموں کا بھی رواج ہو چلا ہے۔ جن میں عورت کو مخاطب بنا کر اردو کے دامن سے امرد پرستی کا داغ دھونے کی کوششوں کا آغاز ہو رہا ہے۔ لاہور میں ہندی پنجابی شاعری اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے سامعہ نواز اوزان بھی۔ لئے جانے لگے ہیں۔ فقط

مرتب

جدید نظم

برسات

(۱)

رُت ہے برسات کی بہت پیاری ۔۔۔ موجزن جھیلیں ندیاں ساری
کھیت دھانوں کے لیئے شاداب ۔۔۔ کر رہے ہیں نظر کی دلداری
کیا ہری دُوب جنگلوں میں ہے ۔۔۔ سبز مخمل سے ہے سوا پیاری
ہر طرف کھل رہے ہیں گُل بوٹے ۔۔۔ جن سے شرمندہ باغ کی کیاری
ننھی ننھی برستی ہیں بوندیں ۔۔۔ رُوح پر ہوتی ہے خوشی طاری
سوندی سوندی زمین کی مٹی ۔۔۔ بھینی بھینی چمن کی بو پیاری
کوکلہ بگلہ کوئلیں طاؤس ۔۔۔ اپنی تانیں سُناتے ہیں پیاری
قازیں مُرغابیاں بطیں سُرخاب ۔۔۔ جھیلوں کے ساتھ کرتی ہیں یاری
شفق سُرخ رنگ لائی ہے ۔۔۔ لالہ گوں ہے سپہر زنگاری
بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پر ۔۔۔ زرد، اودی، سنہری زنگاری
سیرِ مچھی بھون کی چل کر دیکھ ۔۔۔ کیا نمایاں ہے قدرتِ باری

مچھلیوں کی چمک میں ہے چھل بل
جیسے رقصاں بتانِ فرخاری

شہر آشوب

مشکل اپنی ہُوئی جو بود و باش ۔۔۔ آئے لشکر میں ہم برائے تلاش

آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش
ہے لب ناں پہ سو جگہ پرخاش
نے دم آب ہے نہ چمچۂ آش

مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب
جو شناسا ملا سو بے اسباب
تنگدستی سے سب بحال خراب
جس کے ہے پال تو نہیں ہے طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں ہے فراش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال
کنجڑے جھینکے ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال
ایک تلوار بیچے ہے ایک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

پیسے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر
تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر
مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش

شور مطلق نہیں کسو سر میں
زور باقی نہ اسپ و اشتر میں
بھوک کا ذکر اقل و اکثر میں
خانہ جنگی سے امن لشکر میں
نہ کوئی رند نے کوئی اوباش

جتنے ہیں یاں امیر بے دستور
پھر بجسن سلوک سب مشہور
پہنچنا ان تلک بہت ہے دور
بات کہئے کا واں کسے مقدور
حاصل ان سے نہ دل کو غیر خراش

چار لچے ہیں مستعد کار
دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار
لوٹ سے کچھ ہے گر مٹے بازار
سو وہ قند سیاہ ہے یا ماش

در پہ شہدوں کے روز و شب شر و شور
حرف یکسر فریب و رشوت خور
بے لئے دیکھیں نے کسو کی اور
مردہ شو پردہ سب کفن کے چور
رحمۃ اللہ بر اولیں نباش

ہے جنہیں کچھ بھی رویت دربار
سو فریبندہ مکر ہی دغدار
کاذب و مفت بر ہے دل آزار
ڈول ان کا ہے یہ کہ کریئے خوار

کام ان کا ہے یہ خراش و تراش

ہو جو اِن لوگوں میں گدا کا گزر
سہم رہ جائیں سب نہ دیکھیں ادھر
دیر کے بعد یہ کہیں ہل کر
شاہ جی لے خدا سبھوں کی خبر

سو بھی یہ بات ہے پس از کنکاش

یاروں کی جود کا بیاں کیا ہے
وہم میں ان کے بھی جہاں کیا ہے
آشکارا ہے سب نہاں کیا ہے
دیکھتے ہیں کہیں کہ یاں کیا ہے

ایسی صحبت میں ہم نہ ہوتے کاش

بس قلم اب زباں کو اپنی سنبھال
خوشنما کب ہے ایسی قال و مقال
ہے کڈھب چرخ ردسیہ کی چال
مصلحت ہے کہ رہیئے ہو کر لال

فائدہ کیا جو راز کریئے فاش

بیکلی

نہ دماغ ہے کہ کسو سے ہم کریں گفتگو غمِ یار میں
نہ فراغ ہے کہ فقیروں سے ملیں جاکے دِلّی دیار میں

نہ چمن میں جاتے رہا ہے دل نہ بنوں میں پھرتے لگا ہے دل
وہی بیکلی رہی جان کو، رہے سیر میں کہ شکار میں

کہے کون صیدِ رمیدہ سے کہ اِدھر بھی پھر کے نظر کرے
کہ نقاب اُلٹے سوار ہے ترے پیچھے کوئی غبار میں

جھکی کچھ کہ جی میں چبھی سبھی، ہلی ٹک کہ دل میں کُھبی سبھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اسکے ہے، نہ چھری میں ہے نہ کٹار میں

کوئی شعلہ ہے کہ شرارہ ہے کہ ہوا ہے یہ کہ ستارہ ہے
یہی دل جو لے کے گریں گے ہم تو لگیگی آگ مزار میں

سرد مہری روزگار

مدت رہا تھا ساتھ جنوں کے خراب حال — دانستہ ان سبھوں نے کیا مجھکو پائمال
آخر کو آیا مجھ میں انہوں ہیں نپٹ ملال — یہ زندگی سہل ہوئی جان کی وبال
اس جمع میں کسو کو نہ پایا ہیں دستیاب

عرصہ تھا مجھ پہ تنگ اُٹھا ہو کے بیجان — پوچھا نہ مجھکو یک لب نانے کنھوں نے یاں
کم پائی پر بھی سیر کیا میں نے سب جہان — آشفتہ خاطری نے پھرایا کہاں کہاں
برسوں کا راز مجھ سے ہُوا آخر آشکار

پرداخت میری ہو نہ سکی اک امیر سے — عقدہ کھلا نہ دل کا دعائے فقیر سے
فتنے ہمیشہ آتے رہے سر پہ تیر سے — ہر چند التجا کی صغیر و کبیر سے
لیکن ہُوا نہ رفع مرے دل کا اضطراب

در پر ہر ایک دنی کے سماجت مری گئی — نالائقوں سے ملتے لیاقت مری گئی
کیا مفت ہائے شانِ شرافت مری گئی — ایسا پھرایا ان نے کہ طاقت مری گئی
مشہور شہر اب ہوں سبکسار بے وقار

کن نے کی اپنے حال پہ شفقت سے یک نگاہ — نکلے ہے کیسے طور پر اپنی سخن کی راہ
بولا نہ کوئی ہم سے کہ تم کیوں ہوئے تباہ — اسلوب اپنے جینے کا ہو کس طرح سے آہ
ہم ایک ناتوان و ضعیف اور غم ہزار

حالت تو یہ کہ مجھکو غموں سے نہیں فراغ — دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ — ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

میر

جنم کنہیا جی

۲

سب ناری آئیں گوکل کی اور پاس پڑوسن آ بیٹھیں

کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں کچھ گیت چچا کے گاتی تھیں
کچھ ہر دم ناکھ اس بالک کا، بلہاری ہو کر دیکھ رہیں
کچھ تھال پنجیری کے رکھتیں، کچھ سونٹھ سٹورا کرتی تھیں

کچھ کہتی تھیں "ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو"
کچھ کہتیں "ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا دینے کو"
کوئی گھٹی بیٹھی گرم کرے کوئی ڈالے اسپند اور بھوسی
کوئی لائی ہنسلی اور کھڑوے کوئی کرتہ ٹوپی میوہ گھی

کوئی دیکھے روپ اس بالک کا، کوئی ماتھا چومے مہر بھری
کوئی بھنوؤں کی تعریف کرے کوئی آنکھوں کی کوئی پلکوں کی
کوئی کہتی عمر بڑی ہووے اے بیر تمہارے بالے کی
کوئی کہتی بیاہ بھولاؤ، اس آس مرادوں والے کی

کوئی کہتی بالک خوب ہوا اے بہنا تیری نیک رتی
یہ بالے ان کو ملتے ہیں جو دنیا میں ہیں بڑھ بھاگی
اس کنبے کی بھی شان بڑھی اور بھاگ بڑھے اس گھر کے بھی
یہ باتیں سب کی سن سن کر یہ بات جسودا کہتی تھی

اے بیر یہ بالک جو ایسا اب میرے گھر میں جنما ہے
کچھ اور کہوں میں کیا تم سے بھگوان کی مو پر کرپا ہے

نظیر اکبر آبادی

آم

(۳)

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل ہے مگر

آتشِ گُل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ راحت سے ق باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بحکمِ رب النّاس بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر اک بار پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ طوبیٰ وسدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ برگ وبار ہے آم
ناز پروردۂ بہار ہے آم

غالب



عشق مجازی سے توبہ بھلی

(۴)

عشق کے حال سے یارب کوئی آگاہ نہ ہو   پاؤں اس راہ میں رکھ کر کوئی گمراہ نہ ہو
غرق بحرِ غم و اندوہ میں دل آہ نہ ہو   حسنِ یوسف بھی نظر آئے تو کچھ چاہ نہ ہو
مثل ہاروت اسیرِ چہِ بابل ہووے
دل اگر زہرہ جبینوں پہ نہ مائل ہووے

عشق وہ گل ہے کہ دامن میں ہیں جس کے سو خار   عشق وہ نخل ہے جس میں نہ لگا پھل اک بار
عشق وہ میوہ ہے جس میں نہیں لذت زنہار   عشق وہ باغ ہے جس میں کبھی آئی نہ بہار
عشق وہ شاخ ہے جس میں نہیں پتہ دیکھا
عشق وہ غنچہ ہے جس کو نہ شگفتہ دیکھا

چمن دہر میں وہ سبز قدم ہے یہ شجر   خشک ہو سبزۂ ترسایہ میں جس کے یکسر
گرم رفتار ہو گلشن میں ہوا اس کی اگر   سروِ گلزار بنے سروِ چراغاں جل کر
طرف روشوں کے اگر رخ کبھی اس کا ہو جائے
ہو خلش خار کو گل سوکھ کے کانٹا ہو جائے

یہ وہ گل چیں ہے کہ تاراج کرے عیش کا باغ   یہ وہ گلدستہ ہے پھولوں کے عوض جس میں ہیں داغ
یہ وہ نکہت ہے کہ بلبل کا پریشاں ہو دماغ   یہ وہ جھونکا ہے کہ جو زیست کا گل کردے چراغ
سرد اس باد سے گلزار کا مطبخ ہو جائے
اوس شبنم پہ پڑے آتش گل یخ ہو جائے

یہ وہ محفل ہے کہ راحت کا نہیں جس میں گذر   بدلے قلیان دھواں آہ کا ہے ہر لب پر
یہ وہ صحبت ہے کہ ہے پان جہاں خونِ جگر   یہ وہ مجلس ہے کہ پانی کی ہے جا دیدۂ تر
یہ وہ ہے دور کہ ہشیار بھی متوالے ہیں
یہ وہ جلسہ ہے کہ مطرب کے عوض نالے ہیں

سب ہیں آسیب پر آسیب محبت ہے غضب   بھوت بنجاتا ہے عاشق نہیں بنتا کسی ڈھب
ہوتا ہے سایہ فگن دیوِ شبِ فرقت جب   تب یہ چلاتا ہے انسان کہ نبی جان پہ اب

جن کو دعوےٰ ہے دم انکا بھی فنا ہوتا ہے،
حسن پریوں کا حقیقت میں بلا ہوتا ہے،

عشق بے موت سدا رکھتا ہے عشاق کو مار
اس ستمگر کی ادا میں ہے قضا آخر کار
ہووے بیمار محبت کو جو شوق دیدار
چہرۂ یار کے نظارے کے بدلے اکبار
ملک الموت کی شکل اس کو دکھاتا ہے عشق
روزن در کے عوض گور جھنکاتا ہے عشق

جانکنی رہتی ہے دم زیست سے گھبراتا ہے
خواہش مرگ میں بیتابی سے چلاتا ہے
صدمہ اس ہجر کا عشاق کو تڑپاتا ہے
ملک الموت کے نظارے سے گھبراتا ہے
رکھے محفوظ خدا عشق کی بیماری سے
موت بہتر ہے کہیں دل کی گرفتاری سے

(امانت)

ابر کرم

۵

چلنا وہ بادلوں کا زمیں چوم چوم کر
اور اٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر
بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی
سبزہ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی
آتی ادھر صبا ہے ادھر سے نسیم بھی
اور ان کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی
مستی میں جھومنا وہ جوانان باغ کا
جھک جھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا
سبزہ کے عکس سے در و دیوار سبز سبز
سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز
ان سبز سبز کیاریوں پہ دل ہیں لوٹتے
طوطے برنگ طائر بسمل ہیں لوٹتے
شبنم عجب بہار ہے اپنی دکھا رہی،
موتی بکھیرتی ہے جواہر لٹا رہی،
پتوں پہ آب و رنگ سے مینا نگار ہیں
ٹپکیں اگر ہوا سے تو ہیرے کا ہار ہیں
لو بادل اب گرجتے ہوئے سر پہ آگئے
اور شامیانے شرق سے تا غرب چھاگئے
کیا مست آیا جھوم کے سرشار ابر ہے
برسے گا آج خوب دھواں دھار ابر ہے
لیکن یہ باجرا سا برسنا پھوار کا
ہیگا پیام ابر بہاری کے تار کا

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں
اور سبز گیاہ یوں ہیں وہ پھولوں کی ڈالیاں

وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے
وہ کھاڑیاں بھری ہوئیں تھالے چھلک رہے

آبِ رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور روئے سبزہ زار کا دھو کر سنوارنا

گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے
اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے

جل تھل ہیں کوہ و دشت میں تالاب آ گئے
گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے

ہر جا یہ طائرانِ چمن غول غول ہیں
آپس میں بولی بول کے کرتے کلول ہیں،

کوئل کا دُور دُور درختوں پہ بولنا
اور دل میں اہلِ درد کے نشتر گھنگولنا

طاؤس کا وہ دُم کو چنور کرکے ناچنا
اور مورنی کا اشک کے موتی کو جا چگنا

لیکن چمن سے ناچ کے چلتا جو مور ہے
اک قہقہہ یہ طنز لگاتا چکور ہے،

املی کے اک درخت میں جھولا پڑا ہوا
اور ساتھ اس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا

جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے
اور بچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے

ساون کے گیت اٹھا ہے طوفان دلوں میں ہیں
پردیسیوں کی یاد سے ارماں دلوں میں ہیں

پھر مجھ کو رشک ہے اسی مستِ مدام پر
جس کی کہ میکشی نہیں موقوف جام پر

مستانہ بن میں رکھتا ہے دیوانہ طور بھی
مستانے ساتھ رکھتا ہے دو چار اور بھی

سبزہ یہ لوٹتا ہے دماغ آسماں پہ ہے
اور دمبدم یہ مطلع موزوں زباں پہ ہے

یوں پھوٹ کر جو ہیں گل دریچاں نکل پڑے
کیا جانے کن دلوں کے ہیں ارماں نکل پڑے

(آزاد)

قدیم سادہ زندگی

(٦)

یاد ایام کہ بیرنگ تھی تصویر جہاں
دستِ مشاطہ نہ تھا محرم زلفِ دوراں

گل خودرو سے بسا تھا چمن کون و مکاں
چار سُو حسن خداداد کا سکہ تھا رواں

وضع عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک
خطِ قدرت کی وہی شان تھی اور نوک پلک

طفل معصوم کی مانند تھا یہ عالم پیر　　تھے ہم اک صنعت بیچون و چرا کی تصویر
ملک فطرت میں نہ تھی سلطنتِ نفسِ شریر　　طبع نے مملکت روح نہ کی تھی تسخیر
خواب غفلت کی گھٹا دل پہ نہ چھائی تھی بہت
دن چھپا تھا ابھی اور رات نہ آئی تھی بہت

مال و دولت کی ہوس میں نہ گرفتار تھے ہم　　نہ بلندی کے نہ رفعت کے طلبگار تھے ہم
آپ ہی اپنے ہر ایک رنج میں غمخوار تھے ہم　　مددِ غیر سے اصلا نہ خبردار تھے ہم
جو سبق آئے تھے اُستادِ ازل سے لیکر
وہی ہر منزل و ہر راہ میں تھا یاں رہبر

اصل سے دُور بہت ہونے نہ پائے تھے ابھی　　دیس سے چھوٹ کے پردیس میں آئے تھے ابھی
دن جدائی کے نصیبوں نے دکھائے تھے ابھی　　ڈال سے توڑ کے بازار میں لائے تھے ابھی
عرصہ گزرا تھا مسافر کو نہ غربت میں بہت
جی لگا تھا نہ ابھی غیروں کی صحبت میں بہت

صاف آئینۂ دل میں نظر آتا تھا کوئی　　روبرو جس کے جگہہ دل میں نہ پاتا تھا کوئی
جی وہ جی تھا کہ نہ جس جی کو لُبھاتا تھا کوئی　　آنکھ وہ آنکھ تھی جس میں نہ سماتا تھا کوئی
روح تھی بادۂ دوشینہ سے اپنی بدمست
تھا ترقی پہ ابھی نشۂ صہبائے الست

اس قدر عمر دو روزہ پہ نہ مغرور تھے ہم　　عیش و عشرت کے طلسموں سے بہت دور تھے ہم
کسی محنت سے مشقت سے نہ معذور تھے ہم　　آپ ہی راج تھے اور آپ ہی مزدور تھے ہم
تھے غلام آپ ہی اور آپ ہی آقا اپنے
خود ہی بیمار تھے اور خود ہی مسیحا اپنے

خود نمائی و خود آرائی کا کچھ دھیان نہ تھا　　کبر و پندار کا جاری کہیں فرمان نہ تھا
گھر میں سامان نہ تھا در پہ نگہبان نہ تھا　　جی میں فرعون زماں بننے کا ارمان نہ تھا
آکے دنیا میں بہت پاؤں نہ پھیلاتے تھے
اک مسافر کی طرح رہ کے چلے جاتے تھے

ایک سے ایک نہ کم تھا نہ زیادہ سرِ مو　　سب تھے ہم ایک ترائی کے درخت خودرو

حاجتیں لیکے کسی در پہ گئے تھے نہ کبھو　　نہ زمیں بوسی کی عادت تھی نہ تسلیم کی خو
دستِ قدرت کے سوا سر پہ کوئی ہاتھ نہ تھا
ایک قبلہ تھا کوئی قبلۂ حاجات نہ تھا
آمدِ موسمِ گل میں تھا عجب لُطف ہوا　　آندھیوں نے کئے انجام کو طوفان پیدا
چشمہ نزدیک تھا منبع سے تو تھا عین صفا　　جتنا بڑھتا گیا ہوتا گیا پانی گدلا
مٹتے مٹتے اثر صدق و صفا کچھ نہ رہا
آخری دور میں تلچھٹ کے سوا کچھ نہ رہا

راہِ ترقی

مشقت کی ذلت جنھوں نے اُٹھائی　　جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی　　فضیلت نہ عزت نہ فرماں روائی
نہال اس گلستان میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں
نہ بونصر تھا نوع میں ہم سے بالا　　نہ تھا بو علی کچھ جہاں سے نرالا
طبیعت کو بچپن سے محنت میں ڈالا　　ہوئے اس لئے صاحب قدر والا
اگر فکر کسب ہنر تم کو بھی ہو
تمہیں پھر ابو نصر اور بو علی ہو
بہت ہم میں اور تم میں جوہر ہیں مخفی　　خبر کچھ نہ ہم کو نہ تم کو ہے جن کی
اگر جیتے جی کچھ نہ اُن کی خبر لی　　تو ہو جائیں گے مل کے مٹی میں مٹی
یہ جوہر ہیں ہم میں امانت خدا کی
مبادا تلف ہو ودیعت خدا کی
یہی جو کہ پھرتے ہیں بے علم و جاہل　　بہت ان میں ہیں جن کے جوہر ہیں قابل
رذائل میں پنہاں ہیں اُن کے فضائل　　انہیں ناقصوں میں ہیں پوشیدہ کامل
نہ ہوتے اگر مائل لہو بازی
ہزاروں انہیں میں تھے طوسی و رازی

تعلیم اسلام

یہ پہلا سبق تھا کتاب ھُدا کا — کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا — خلائق سے ہے جس کو رشتہ وِلا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایمان
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انسان

عمل جن کا ہے اس کلامِ متین پر — وہ سرسبز ہیں آج رُوئے زمین پر
تفوق ہے اُن کو کہین و مہین پر — مدارِ آدمیت کا ہے اب اُنہیں پر
شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے
وہ لے جا کے سب اہلِ مغرب نے جوڑے

سمجھتے ہیں گمراہ جن کو مسلمان — نہیں جن کو عقبےٰ میں اُمیدِ غفراں
نہ حصّے میں فردوس جنکے نہ رضوان — نہ تقدیر میں حور جن کے نہ غلماں
پس از مرگ دوزخ ٹھکانا ہے جن کا
حمیم آب و زقّوم کھانا ہے جن کا

وہ مُلک اور ملّت پہ اپنی فدا ہیں — سب آپس میں اک اک کے حاجت روا ہیں
اولوالعلم ہیں اُن میں یا اغنیا ہیں — طلبگار بہبودِ خلقِ خدا ہیں
یہ تمغہ تھا گویا کہ حصّہ اُنہیں کا
کہ حُبّ الوطن ہے نشان مومنین کا

امیروں کی دولت غریبوں کی ہمّت — ادیبوں کی انشا حکیموں کی حکمت
فصیحوں کے خطبے شجاعوں کی جرأت — سپاہی کے ہتھیار شاہوں کی طاقت
دلوں کی اُمیدیں اُمنگوں کی خوشیاں
سب اہلِ وطن اور وطن پر ہیں قرباں

عروج ان کا جو تم عیاں دیکھتے ہو — جہاں میں اُنہیں کامراں دیکھتے ہو
مطیع ان کا سارا جہاں دیکھتے ہو — انہیں برتر از آسماں دیکھتے ہو
یہ ثمرے ہیں ان کی جوانمردیوں کے
نتیجے ہیں آپس کی ہمدردیوں کے

ہمارے شاعروں کی حالت

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر ملک جس سے شرماتے ہیں آسمان پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنّم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

سخن جو ہے یاں آج حصّہ ہمارا نہیں قوم کو ظاہرا جس سے چارا
ہر اک کذب و بُہتاں ہے جسمیں گوارا مجسّم ہو اُس کا اگر جھوٹ سارا
بنے ہند میں اُس سے اور اک ہمالا
ہمالہ سے ہو جس کی چوٹی دو بالا

زمانہ میں جتنے قلی اور نفر ہیں کمائی سے اپنی وہ سب بہرہ ور ہیں
گویئے امیروں کے نورِ نظر ہیں ڈفالی بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں
مگر اس تپ دق میں جو مبتلا ہیں
خدا جانے وہ کس مرض کی دوا ہیں

جو سقّے نہ ہوں جی سے جائیں گزر سب ہو میلا جہاں گم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب جو نظر جائیں مہتر تو گندے ہوں گھر سب
پہ گر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے

عرب جو تھے دُنیا میں اس فن کے بانی نہ تھا کوئی آفاق میں جن کا ثانی
زمانہ نے جن کی فصاحت تھی مانی مٹا دی عزیزوں نے اُن کی نشانی
سب اُن کے ہنر اور کمالات کھو کر

رہے شاعری کو بھی آخر ڈبو کر

اَدب میں پڑی جان اُن کی زبان سے
جلا دین نے پائی اُن کے بیاں سے
سناں کے لئے کام اُنہوں نے لساں سے
زبانوں کے کوچے تھے بڑھ کر سناں سے

ہوئے اُن کے شعروں سے اخلاق صیقل
پڑی اُن کے خطبوں سے عالم میں ہل چل

خلف اُن کے یاں جو کہ جادو بیاں ہیں
فصاحت میں مقبول پیر و جوان ہیں
بلاغت میں مشہورِ ہندوستان ہیں
وہ کچھ ہیں تو لے دیکے اس گوں کے ہاں ہیں

کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں
تو بھانڈ اُن کی غزلیں مجالس میں گائیں

طوائف کو ازبر ہیں دیوان اُن کے
گویّوں پہ بیحد ہیں احسان اُن کے
نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان اُن کے
ثنا خواں ہیں ابلیس وشیطان اُن کے

کہ عقلوں پہ پردے دیئے ڈال اُنہوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال اُنہوں نے

شُرفا کی اَولاد

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے
تباہ اُن کی حالت بُری اُن کی گت ہے
کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے
کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے

چرس اَور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اَور چنڈو کا رسیا ہے کوئی

سدا گرم الفار سے اُن کی صحبت
ہراک رند و اوباش سے اُن کی مِلّت
پڑھے لکھوں کے سایہ سے اُنکو وحشت
مدارس کی تعلیم سے اُن کو نفرت

کمینوں کے جرگہ میں عمریں گنوانی
اُنہیں گالیاں دینی اَور آپ کھانی

نہ علمی مدارس میں ہیں اُن کو پاتے
نہ شائستہ جلسوں میں ہیں آتے جاتے

یہ میلوں کی رونق ہیں جا کر بڑھاتے
پڑے پھرتے ہیں دیکھتے اور دکھاتے
کتاب اور معلم سے پھرتے ہیں بھاگے
مگر ناچ گانے میں ہیں سب سے آگے

اگر کبھی اُن پاک شہدوں کی گنتی
ہوا جن کے پہلو سے بچ کر ہے چلتی
ملی خاک میں جن سے عزت بڑوں کی
مٹی خاندانوں کی جن سے بزرگی
تو یہ جس قدر خانہ برباد ہوں گے
وہ سب ان شریفوں کی اولاد ہوں گے

ہوئی اُن کی بچپن میں یوں پاسبانی
کہ قیدی کی جیسے کٹے زندگانی
لگی ہونے جب کچھ سمجھ بوجھ سیانی
چڑھی بھوت کی طرح سر پر جوانی
بس اب گھر میں دشوار تھمنا ہے اُن کا
اکھاڑوں میں تکیوں میں رہنا ہے اُن کا

نشہ میں مے عشق کے چور ہیں وہ
صفِ فوج مژگاں میں محصور ہیں وہ
غم چشم و ابرو میں رنجور ہیں وہ
بہت ہاتھ سے دل کے مجبور ہیں وہ
کریں کیا کہ ہے عشق طینت میں اُن کی
حرارت بھری ہے طبیعت میں اُن کی

اگر شش جہت میں کوئی دلربا ہے
تو دل اِن کا نادیدہ اُس پر فدا ہے
اگر خواب میں کچھ نظر آ گیا ہے
تو یاد اُس کی دن رات نامِ خدا ہے
بھری سب کی وحشت سے روداد ہے یاں
جسے دیکھئے قیس و فرہاد ہے یاں

اگر ماں ہے دُکھیا تو اُن کی بلا سے
اپاہج ہے باوا تو اُن کی بلا سے
جو ہے گھر میں فاقہ تو اُن کی بلا سے
جو مرتا ہے کُنبا تو اُن کی بلا سے
جنہوں نے لگائی ہو لو دلربا سے
غرض پھر اُنہیں کیا رہی ماسوا سے

نہ گالی سے دشنام سے جی چُرائیں
نہ جوتی سے پیزار سے ہچکچائیں
جو میلوں میں جائیں تو پُھبتن دکھائیں
جو محفل میں بیٹھیں تو فتنے اُٹھائیں

لرزتے ہیں اوباش اُن کی ہنسی سے
گریزاں ہیں رند اُن کی ہمسائیگی سے

سپوتوں کو اپنے اگر بیاہ دیجے
تو بہوؤں کا بوجھ اپنی گردن پہ لیجے
جو بیٹی کے پیوند کی فکر کیجے
تو بَد راہ ہیں بھانجے اور بھتیجے

یہی جھینکنا کو بکو گھر بہ گھر ہے
بہو کا ٹھکانا نہ بیٹی کو بَر ہے

نہ مطلب نگاری کا ان کو سلیقہ
نہ دربار داری کا ان کو سلیقہ ہے
نہ امیدواری کا ان کو سلیقہ
نہ خدمت گذاری کا ان کو سلیقہ ہے

قُلی یا نفر ہو تو کچھ کام آئے
نگران کو کس مَد میں کوئی کھپائے

نہیں ملتی روٹی جنہیں پیٹ بھر کے
وہ گذران کرتے ہیں سو عیب کر کے
جو ہیں ان میں دو چار آسودہ گھر کے
وہ دن رات خواہاں ہیں مرگِ پدر کے

نمونے یہ اعیان و اشراف کے ہیں
سلف انکے وہ تھے خلف اُنکے یہ ہیں

اُمید

بس اے ناامیدی نہ یُوں دل بُجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تو
فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تونے سر سبز کی ہیں

سفینہ پئے نوحؑ طوفان میں تو تھی
سکوں بخش یعقوبؑ کنعاں میں تو تھی
زلیخا کی غمخوار ہجراں میں تو تھی
دل آرام یوسفؑ کی زندان میں تو تھی

مصائب نے جب آن کر اُن کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تو نے　　بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اُکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تو نے　　اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے
بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

قوی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی　　بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خورد و کلاں کی
تجھی پر ہے بُنیاد نظمِ جہاں کی　　نہ ہو تو تو رونق نہ ہو اس دُکاں کی
تگاپو ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
رَوا رَو ہے ہر قافلے میں تجھی سے

کسانوں سے کلّر میں تو ہے بُوآتی　　جہازوں کو گرداب میں ہے کھواتی
سکندر کو دارا پہ ہے تو چڑھاتی　　فریدوں کو ضحاک سے ہے لڑاتی
چلے سب جدھر تو نے مائل عناں کی
نظر تیری سیٹی پہ ہے کارواں کی

نوازا بہت بینواؤں کو تو نے　　توانگر بنایا گداؤں کو تو نے
دیا دسترس نارساؤں کو تو نے　　کیا بادشہ ناخداؤں کو تو نے
سکندر کو شانِ کئی تو نے بخشی
کلمبس کو دُنیا نئی تو نے بخشی

وہ رہرو نہیں رکھتے جو کوئی ساماں　　خورو زاد سے جن کا خالی ہے داماں
نہ ساتھی کوئی جس سے منزل ہو آساں　　نہ محرم کوئی جو سُنے دردِ پنہاں
ترے بل پہ خوش خوش ہیں اس طرح جاتے
کہ جا کر خزانہ ہیں اب کوئی پاتے

زمیں جوتنے کو جب اُٹھتا ہے جوتا　　سمیں کا گماں تک نہیں جبکہ ہوتا
شب و روز محنت میں ہے جاں کھوتا　　مہینوں نہیں پاؤں پھیلا کے سوتا
اگر موج زن اُسکے دل میں نہ تو ہو
تو دنیا میں غل بھوک کا چار سو ہو

بنے اُس سے بھی گر سوا اپنے دم پر　　بلاؤں کا ہو سامنا ہر قدم پر

پہاڑ اک فزوں اور ہو کوہِ غم پر
گذرنی ہو جو کچھ گذر جائے ہم پر
نہیں فکر۔ تو دل بڑھاتی ہے۔ جب تک
دماغوں میں بُو تیری آتی ہے جب تک
یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے
عزیزوں کی غفلت وہی جُوں کی تُوں ہے
جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے
تعصب کی گردن پہ ملّت کا خوں ہے
مگر اے امید اک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دُنیا میں سارا ہے تیرا

کاہل

بنی نوع میں دو طرح کے ہیں انساں
تفاوت ہے حالت میں جن کی نمایاں
کچھ ان میں ہیں راحت طلب اور تن آسان
بدن کے نگہبان بستر کے درباں
نہ محنت پہ مائل نہ قدرت کے قائل
سمجھتے ہیں تنکے کو رستہ میں حائل
اگر ہیں تونگر تو بے کار ہیں سب
اپاہج ہیں روگی ہیں بیمار ہیں سب
تعیش کے ہاتھوں سے لاچار ہیں سب
تن آسانیوں میں گرفتار ہیں سب
برابر ہے یاں اُن کا ہونا نہ ہونا
نہ کچھ جاگنا اُن کا بہتر نہ سونا
اگر ہیں تہیدست اور بے نوا وہ
تو محنت سے ہیں جی چُراتے سدا وہ
نصیبوں کا کرتے ہیں اکثر گلا وہ
ہلاتے نہیں کچھ مگر دست و پا وہ
اگر بھیک ملجائے قسمت سے اُن کو
تو سو بار بہتر ہے محنت سے اُن کو
نہ جو بے نوا ہیں نہ ہیں کچھ تونگر
وہ ہیں ڈھور کی طرح قانع اسی پر
کہ کھانے کو ملتا رہے پیٹ بھر کر
نہیں بڑھتے بس اس سے آگے قدم بھر
ہوئے زیور آدمیت سے عاری
معطل ہوئیں قوتیں اُنکی ساری

نہ ہمت، کہ محنت کی سختی اُٹھائیں ۔ نہ جرأت، کہ خطروں کے میدان میں جائیں
نہ غیرت، کہ ذلت سے پہلو بچائیں ۔ نہ عبرت، کہ دنیا کی سمجھیں ادائیں
نہ کل فکر تھا یہ کہ ہیں اس کے پھل کیا
نہ ہے آج پروا کہ ہونا ہے کل کیا

نہیں کرتے کھیتی میں وہ جانفشانی ۔ نہ ہل جوتتے ہیں نہ دیتے ہیں پانی
پہ جب یاس کرتی ہے دل پر گرانی ۔ تو کہتے ہیں حق کی ہے نا مہربانی
نہیں لیتے کچھ کام تدبیر سے وہ
سدا لڑتے رہتے ہیں تقدیر سے وہ

کبھی کہتے ہیں ہیچ سب ہیں یہ ساماں ۔ کہ خود زندگی ہے کوئی دن کی مہماں
دھرے سب یہ رہجائینگے کاخ و ایواں ۔ نہ باقی رہے گی حکومت نہ فرماں
ترقی اگر ہم نے کی بھی تو پھر کیا
یہ بازی اگر جیت لی بھی تو پھر کیا

یہ سرگرم کوشش میں جو روز و شب ہیں ۔ اُٹھاتے سدا بار رنج و تعب ہیں
ترقی کے میداں میں سبقت طلب ہیں ۔ نمائش پہ دُنیا کی بھولے یہ سب ہیں
نہیں ان کو کچھ اپنی محنت سے لہنا
بناتے ہیں وہ گھر نہیں جس میں رہنا

کبھی کرتے ہیں عقل انساں پہ نفریں ۔ کہ باوصف کوتاہ بینی ہے خود بیں
وہ تدبیریں اس طرح کرتی ہے تلقیں ۔ کہ گویا کھلا اُسپہ ہے سرِ تکویں
مگر سب خیالات ہیں خام اُس کے
ادھورے ہیں جتنے ہیں یاں کام اُسکے

نہ اسباب راحت کی اُس کو خبر کچھ ۔ نہ آثارِ دولت کی اُس کو خبر کچھ
نہ عزت نہ ذلت کی اُس کو خبر کچھ ۔ نہ کلفت نہ راحت کی اُس کو خبر کچھ
نہ آگاہ اس سے کہ ہستی ہے شے کیا
نہ واقف کہ مقصود ہستی سے ہے کیا

کبھی کہتے ہیں زہر ہے مال و دولت ۔ اُٹھاتے ہیں جس کے لئے رنج و محنت

اسی سے گناہوں کی ہوتی ہے رغبت
اسی سے دماغوں میں آتی ہے نخوت
یہی حق سے کرتی ہے بندوں کو غافل
ہوئے ہیں عذاب اس سے قوموں پہ نازل

کبھی کہتے ہیں سعی و کوشش سے حاصل؟
کہ مقسوم بن کوششیں سب ہیں باطل؛
نہیں ہوتی کوشش سے تقدیر زائل
برابر ہیں یاں محنتی اور کاہل؛
ہلانے سے ڈوری کے گر ڈور ہلتی ؛
تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی ؛

نکموں کے ہیں سب یہ دلکش ترانے
سُلانے کو قسمت کے رنگیں فسانے
اسی طرح کے کرکے حیلے بہانے
نہیں چاہتے دست و بازو ہلانے
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

شرافت محنت

نہ راحت طلب ہیں نہ دولت طلب وہ
لگے رہتے ہیں کام میں روز و شب وہ
نہیں لیتے دم ایک دم بے سبب وہ
بہت جاگ لیتے ہیں سوتے ہیں تب وہ
وہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دنیا
کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دنیا

چنیں گر نہ وہ ہوں کھنڈر کاخ و ایواں
بنیں گر نہ وہ شاہ کشور ہو عریاں
جو بوئیں نہ وہ تو ہوں جاندار بے جاں
جو چھانٹیں نہ وہ تو ہوں جنگل گلستاں
یہ چلتی ہے گاڑی اُنہیں کے سہارے
جو وہ کل سے بیٹھیں تو بیکل ہوں سارے

کھپاتے ہیں کوشش میں تاب و تواں کو
گھلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں کو
سمجھتے نہیں اسمیں جاں اپنی جاں کو
وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو
بس اس طرح جینا عبادت ہے اُن کی
اور اس دھن میں مرنا شہادت ہے ان کی

مشقت میں عُمر اُن کی کٹتی ہے ساری — نہیں آتی آرام کی اُن کے باری
سدا بھاگ دوڑ اُن کی رہتی ہے جاری — نہ آندھی میں عاجز نہ مینہ میں ہیں عاری
نہ لوں جیٹھ کی دم تڑاتی ہے اُن کا
نہ پھر ماگھ کی جی چھڑاتی ہے اُن کا

نہ احباب کی تیغِ احساں سے گھائل — نہ بیٹے سے طالب نہ بھائی سے سائل
نہ دُکھ درد میں سوئے آرام مائل — نہ دریا و کہ ان کے رستہ میں حائل
سُنے ہوں کبھی رستم و سام جیسے
غیور اب بھی لاکھوں ہیں گمنام ویسے

کسی کو یہ دُھن ہے کہ جو کچھ کمائیں — کھلائیں کچھ اوروں کو کچھ آپ کھائیں
کسی کو یہ کد ھے کہ جھیلیں بلائیں — پہ احساں کسی کا نہ ہرگز اُٹھائیں
کوئی محو ہے فکرِ فرزند و زن میں
کوئی چُور ہے حُبِّ اہلِ وطن میں

جو مصروف ہے کشتکاری میں کوئی — تو مشغول دوکانداری میں کوئی
عزیزوں کی ہے غمگساری میں کوئی — ضعیفوں کی خدمتگذاری میں کوئی
یہ ہے اپنی راحت کے سامان کرتا
وہ کُنبہ پہ ہے جان قربان کرتا

کوئی اس تگ و دو میں رہتا ہے ہردم — کہ دولت جہاں تک ہو کیجے فراہم
رہیں جیتے جی تاکہ خود شاد و خرم — مَریں جب تو دل پر نہ لیجائیں یہ غم
کہ بعد اپنے کھائینگے فرزند و زن کیا
لباس اُن کا اور اپنا ہوگا کفن کیا؟

بہت دل میں اپنے یہ رکھتے ہیں ارماں — کہ کر جائیں یاں کوئی کار نمایاں
وہ ہوں تاکہ جب چشمِ عالم سے پنہاں — تو ذکرِ جمیل اُن کا باقی رہے یاں؟
یہی طالبِ شہرت و نام لاکھوں؟
بناتے ہیں جمہور کے کام لاکھوں

غمخواری بنی نوع انساں

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے
نشاں جن سے قائم ہیں صدق وصفا کے
نہ شہرت کے خواہاں نہ طالب ثنا کے
نمائش سے بیزار دشمن ریا کے
ریاضت سب اُن کی خدا کے لئے ہے
مشقت سب اُن کی قضا کے لئے ہے

کوئی ان میں ہے حق کی طاعت پہ مفتوں
کوئی نام حق کی اشاعت پہ مفتوں
کوئی زہد و صبر و قناعت پہ مفتوں
کوئی پند و وعظ جماعت پہ مفتوں
کوئی موج سے آپ کو ہے بچاتا
کوئی ناؤ ہے ڈوبتوں کی تراتا

بہت نوع انساں کے غمخوار و یاور
ہواخواہ ملت پہ اندیشں کشور
شدائد کے دریائے خوں میں شناور
جہاں کی پُر آشوب کشتی کے لنگر
ہر اک قوم کی ہست و بود ان سے ہے یاں
کہ اس انجمن کی نمود ان سے ہے یاں

کسی پہ ہو سختی صعوبت ہے ان پر
کسی پہ ہو غم رنج و کلفت ہے ان پر
کہیں ہو فلاکت مصیبت ہے ان پر
کہیں آئے آفت قیامت ہے ان پر
کسی پر چلے تیر آماج یہ ہیں
لٹے کوئی رہگیر تاراج یہ ہیں

یہ ہیں حشر تک بات پر اڑنے والے
یہ پیماں کو میخوں سے ہیں جڑنے والے
یہ فوج حوادث سے ہیں لڑنے والے
یہ غیروں کی ہیں آگ میں پڑنے والے
اُمنڈتا ہے رُکنے سے اور اُن کا دریا
جنوں سے زیادہ ہے کچھ ان کا سودا

جماتے ہیں جب پاؤں ہٹتے نہیں یہ
بڑھا کر قدم پھر پلٹتے نہیں یہ
گئے پھیل جب پھر سمٹتے نہیں یہ
جہاں بڑھ گئے بڑھ کے گھٹتے نہیں یہ
ھم بن گئے مر نہیں بیٹھتے یہ
جب اُٹھتے ہیں اُٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ

خدا نے عطا کی ہے جو ان کو قوت　　سمائی ہے دل میں بہت اس کی عظمت
نہیں پھیرتی اُن کا مُنہ کوئی زحمت　　نہیں کرتی زیر اُن کو کوئی صعوبت
بھروسہ پہ اپنے دل و دست و پا کے
سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے

نہیں مرحلہ کوئی دشوار اُن کو　　ہر اک راہ ملتی ہے ہموار اُن کو
گلستاں ہے صحرائے پُرخار اُن کو　　برابر ہے میداں و کہسار اُن کو
نہیں حائل اُن کے کوئی رہگذر میں
سمندر ہے پایاب اُن کی نظر میں

اسی طرح یاں اہلِ ہمت ہیں جتنے　　کمر بستہ ہیں کام پر اپنے اپنے
جہان کی ہے سب دھوم دھام انکے دم سے　　فقیر اور غنی سب طفیلی ہیں ان کے
بغیر انکے بے ساز و ساماں تھی مجلس
نہ ہوتے اگر یہ تو ویراں تھی مجلس

زمین سب خدا کی ہے گلزار انہیں سے　　زمانہ کا ہے گرم بازار انہیں سے
ملے ہیں سعادت کے آثار انہیں سے　　کُھلے ہیں خدائی کے اسرار انہیں سے
انہیں پر ہے کچھ فخر ہے گر کسی کو
انہیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو

انہیں سے ہے آباد ہر مُلک و دولت　　انہیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملت
انہیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت　　انہیں کی ہے سب ربع مسکوں میں برکت
دم ان کا ہے دُنیا میں رحمت خدا کی
انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

انہیں کا اُجالا ہے ہر رہگذر میں　　انہیں کی ہے یہ روشنی دشت و در میں
انہیں کا ظہورا ہے سب خشک و تر میں　　انہیں کے کرشمے ہیں سب بحر و بر میں
انہیں سے ہے رُتبہ یہ آدم نے پایا
کہ سر اُس سے روحانیوں نے جھکایا

ہر اک مُلک میں خیر و برکت ہے ان سے　　ہر اک قوم کی شان و شوکت ہے ان سے

نجابت ہے اِن سے شرافت ہے اِن سے
شرف اِن سے فخر انسے عزت ہے اِن سے
جفاکش بنو گر ہو عزت کے خواہاں
کہ عزت کا ہے بھید ذلت میں پنہاں

حالی

مجاز سے حقیقت تک

(۱)

چہرہ سے نقاب اپنے ہٹادے مرے گلفام
پھر دیکھ کہ کس طرح چمکتا ہے لبِ بام
مہتاب سے جاتی ہے بدل تیرگی شام
آتے ہیں قدم چومنے کو چرخ سے اجرام
بجلی سی ابھی کوندنے لگتی ہے فضا میں
اس نور کا دریا نظر آتا ہے ہوا میں

(۲)

کر چشمِ فسوں ساز کو آمادہ ادا پر
پھر دیکھ کہ پریاں تری ہوتی ہیں مسخر
سجدہ میں ترے سامنے گرتے ہیں فسونگر
کھلتے ہیں اشاروں میں ترے حسن کے دفتر
شہرت تری پھیلے ابھی جادو نظروں میں
ہو جائے قیامت سی بپا عشوہ گروں میں

(۳)

رکھ سامنے آئینہ ذرا اے بتِ خوشرنگ
پھر دیکھ کہ ہوتا ہے وہ جلوہ سے ترے دنگ
ہو جائے مقابل جو ترے حسن کا نیرنگ
تاروں کی تجلی بھی ٹھہرتی نہیں پاسنگ
چشمہ تری شوخی کا اگر یار ابل جائے
آغوش سے آئینہ کے سیماب نکل جائے

(۴)

جنبش میں تو لا اپنے قدِ جلوہ فگن کو
پھر دیکھ کہ آتی ہے حیا سروِ چمن کو
بھولیگا ابھی کبک وری اپنے چلن کو
یاد آئیگی یہ چال نہ آہوئے ختن کو

شوخی ہے تری چال میں مستی بھی ادا بھی
ہر نقش قدم پر ترے جھکتی ہے ہوا بھی

(۵)

ہستی ہے تری حسن کا بے تھاہ سمندر — ہر ذرہ ترے جسم کا ہے چشمۂ خاور
رگ رگ میں تری برق سی اک رہتی ہے مضطر — رکھے گا نہاں پردہ میں کب تک رخِ انور
گیتی پہ نظر ڈال ذرا ناز و ادا سے
آتی ارنی کی ہے صدا ارض و سما سے

(۶)

اے حسنِ جہاں سوز دکھا جلوۂ عریاں — تارے بھی ترے شوق کے رستے میں ہیں رقصاں
ہے نورِ سحر دھن میں ترے چاک گریباں — ہے بادِ صبا بھی تری منزل میں شتاباں
گل کھول کے آنکھیں تری آمد کو ہیں تکتے
مرغانِ چمن یاد میں تیری ہیں چہکتے

(۷)

ملبوس مجازی میں تو اب تک ہے ضیاپاش — لازم ہے کہ اب حسنِ حقیقت کو کرے فاش
دیکھیں تجھے بے پردہ ہم اے حسنِ ازل کاش — باقی نہ رہے صورت و معنی میں یہ پرخاش
دھوکا جو نظر کا ہے وہ اٹھ جائے نظر سے
قطرہ کا کھلا رشتہ ہو تابندہ گہر سے

(۸)

میں قطرۂ شبنم ہوں تو خورشیدِ درخشاں — یہ قطرہ ترے نور کے چشمے میں ہو پنہاں
میں دستۂ خاشاک ہوں تو شعلۂ عریاں — کر صورتِ گلدستہ تو اس دستہ کو خنداں
گل ہو کے مری شمع رخِ صبح دکھا جائے
ہستی مری مٹ کر تری ہستی میں سما جائے

حُسن کی زبان سے

(۱)

جہاں میں ہے ضیا مری میں حُسنِ جلوہ کار ہوں
میں رونق اس چمن کی ہوں میں فصلِ نوبہار ہوں
میں زیبِ کائنات ہوں میں فخرِ روزگار ہوں
میں شاہدِ نہفتہ کا جمالِ آشکار ہوں
کہ آئینے میں دہر کے مَیں عکس کردگار ہوں

(۲)

کلیم کو نہ اپنا رخ میں بے خطر دکھا سکا
سُراغ میرے نور کا نہ کوہِ طور پا سکا
نہ میں نظر میں آسکا نہ عقل میں سما سکا
خیال میرے اوج پر نہ پر لگا کے جا سکا
میں حصنِ بے شکست ہوں میں راہِ ناگزار ہوں

(۳)

پڑی ہے اک خفیف سی نجوم پر کرن مری
کہ رکھتی ہے طواف میں اُنہیں صدا لگن مری
چھُپی حجابِ قدس میں ہے شمعِ انجمن مری
ستارے جلکے خاک ہوں جو دیکھ لیں پھبن مری
میں گنجِ آب تاب ہوں میں بحرِ نور و نار ہوں

(۴)

یہ چاندنی کی ٹھنڈکیں، یہ دھوپ کی حرارتیں
یہ صبح کی صباحتیں، یہ شام کی ملاحتیں
زمین کی یہ زینتیں، فلک کی یہ لطافتیں
یہ بجلیوں کی شوخیاں، یہ بادلوں کی رنگتیں
یہ رنگ روپ ہیں مرے، مَیں ان میں آشکار ہوں

(۵)

ہر ایک شاخسار میں، مجھی سے آب و رنگ ہے
پھبکتے ہیں درخت جو، یہ میری ہی اُمنگ ہے
پُھدکتے ہیں، پرند سب، مجھی سے یہ ترنگ ہے
کرشمے دیکھکر مرے، ہر ایک عقل دنگ ہے
ہیں کھیل نت نئے مرے، مَیں وہ طلسم کار ہوں

(۶)

گُلوں کے رنگ رنگ سے عیاں ہیں جھلکیاں مری
چمن کے غنچہ غنچہ میں شمیم ہے نہاں مری
زباں پہ پتّے پتّے کی رواں ہے داستاں مری
سُرنگ پود پود کی جڑوں میں ہے دواں مری

میں رُوحِ سبزہ زار ہوں، میں نازشِ بہار ہوں

سلیم

یسیر کا پیام ماں کے نام

(۸)

ایک بچہ جس کی ماں کا ہو گیا تھا انتقال
میرے پاس آیا کہیں سے روتا روتا ایک دن

اور کہا رو کر کہ ماں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں
کھانا تک کھایا نہیں ہے صاف گزرا ایک دن

چھوڑ کر بے کس خدا جانے کہاں رخصت ہوئی
ہے بہت مشکل مجھے بے ماں کے جینا ایک دن

تم سے مل جائے تو کہنا مجھ کو بھی لے جائے ساتھ
یا چلی آئے وہاں سے رہ کے دو یا ایک دن

کیسی بستی ہے وہ کیسے گھر ہیں کیسے لوگ ہیں
تو نے تو جا کر وہاں خط بھی نہ بھیجا ایک دن

پیار کرتی مُنہ دُھلاتی کپڑے پہناتی تھی روز
یوں پھٹے کرتے سے میں رہتا نہیں تھا ایک دن

کون چمکارے مجھے اور کون لے آغوش میں
خواب میں بھی تو نے حال آ کر نہ پوچھا ایک دن

اپنے سینے سے کبھی اک دم نہ کرتی تھی جُدا
اب یہ تنہا بیکسی میں کیسے چھوڑا ایک دن

اب نہیں کرنے کا ضد، اب کچھ نہ مانگوں گا کبھی
خستہ حالی پر مری آ رحم فرما ایک دن

اب نہیں رونے کا رونے سے خفا ہے تو اگر
اچھی اماں گود میں لے لے مجھے آ ایک دن

تجھ کو بن میرے وہاں کٹتے ہیں کیسے روز و شب
مجھ کو بے تیرے یہاں ہے سو برس کا ایک دن

اے خدا ایسے یتیم و بے نوا پر فضل کر
یہ دعا کی اور اکبر خوب رویا ایک دن

اکبر

ایک حسین لڑکی

(۹)

چہرہ یہ پیارا پیارا آنکھیں یہ کالی کالی
لب گل کی پتیاں ہیں صورت ہے بھولی بھولی

نازک بدن ہے اس کا یا نخلِ گل کی ڈالی
چہرہ کا رنگ دیکھو کہہ دو کہ پھول والی

رُخ پر جو آرہی ہیں اڑ کر لٹیں ہوا سے
مہکا رہی ہے ان کو کس ناز سے ادا سے

ناز اس کے قدرتی ہیں ان سے ہے بیخبر خود
دلکش نظر ہے لیکن واقف نہیں نظر خود
بالوں میں بن رہے ہیں گھونگر ادھر ادھر خود
وارفتہ ہو رہا ہے حسن اس کی شکل پر خود

وارستگی تو دیکھو بے خود ہے کس قدر یہ
آنچل زمیں پہ لوٹا لیکن ہے بے خبر یہ

چوٹی نہیں بندھی ہے بال اڑتے ہیں ہوا سے
بُندے اُلجھ گئے ہیں بالوں میں تو بلا سے
بالوں پہ جمتی ہے گرد اُڑ اُڑ کے جا بجا سے
سر پر چمک رہے ہیں ذرّے ذرا ذرا سے

کُرتا کریب کا ہے کانٹوں پہ ہے وہ اٹکا
دامن پھٹا وہ دیکھو کھینچا جو دیکے جھٹکا

کرتے کو دیکھ کر یہ پہلے تو مسکرائی
پھر کچھ جو دھیان آیا حیرت سی رُخ پہ چھائی
پوچھے گی ماں کہاں سے کُرتے کو پھاڑ لائی
یہ ڈر نہیں تو چھوٹی چہرہ پہ کیوں ہوائی

کُرتے کو دیکھتی ہے کانٹوں کو دیکھتی ہے
ماں سے یہ کیا کہیگی بس سوچ اسے یہی ہے

ٹہلی پھر اٹھ کے اب کچھ تسکین پا رہی ہے
رنگت اُڑی ہوئی پھر چہرہ پہ آرہی ہے
چھوٹی سی آرسی کو نظروں میں لا رہی ہے
خود منہ چڑا رہی ہے خود مسکرا رہی ہے

لائی ہوا جو اپنے دامن میں گرد بھر کے
آنچل میں منہ چھپایا آنکھوں کو بند کر کے

چل نکلی اور ٹھٹک کر مجھ پر نگاہ ڈالی
میں اس کو دیکھتا ہوں یہ بات اس نے پالی
آنکھیں اُٹھا کے دیکھا اور پھر نظر بچالی
یہ قدرتی حیا ہے دل کی لبھانے والی

دیکھے جو پھر تو شاید ترچھی نظر سے دیکھے
پھیرا ہے رُخ تو شاید مڑ کر ادھر سے دیکھے

دیکھا تو اس نے لیکن گردن جھکا کے دیکھا
آنچل کو سر پہ ڈالا اور مسکرا کے دیکھا
کیا ترچھی چتونوں سے آنکھیں چُرا کے دیکھا
دیکھا پھر اس نے دیکھو آنچل ہٹا کے دیکھا

پایا نیا جو مجھ کو کچھ شرم آئی اس کو
فطرت کی یہ ادا ہے بننے کا فہم کس کو

چشمے کی راہ لی ہے شاید پیئے گی پانی
پہنچی تو دیکھتی ہے چُپ سُن کھڑی روانی
عکس فلک کی رنگت سُورج کی ضوفشانی
پانی تو ہے سُنہرا اور تہ ہے آسمانی
لہروں میں چلتی پھرتی سُورج کی جو چمک ہے
اس سے چمک ہی ہے کیا بجلیوں کا شک ہے

وہ پائینچے سنبھالے پانی تو خیر کم ہے
ٹخنوں ہی تک ہے گہرا اور چند ہی قدم ہے
لیکن لچک بدن میں چلنے سے دم بدم ہے
نازک ہے پاؤں پھسلے پانی میں تو ستم ہے
وہ اوڑھنی نہ سنبھلی پانی سے تر ہوئی ہے
وہ لڑکھڑائی دیکھو دُھری کمر ہوئی ہے

نالا اُتر کے پہنچی زیر شجر کھڑی ہے
ننھے سے دل پہ اس کے ہمت بہت بڑی ہے
کچھ اوڑھنی بدن پر کچھ خاک پر پڑی ہے
خوشے پکے ہوئے ہیں ان سے نظر لڑی ہے
میں جامنیں گرادوں بہلے یہیں تو اچھا
کھیلے یہیں تو اچھا ٹہلے یہیں تو اچھا

شوق قدوائی

آغاز محبت

(۱۰)

یاد ہیں سارے وہ عیش بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے
وہ سراپا ناز تھا۔ بیگانۂ رسمِ جفا
اور مجھے حاصل تھے لُطف بے نہایت کے مزے
حُسن سے وہ اپنے غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
میری جانب سے نگاہِ شوخ کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغاز شرارت کے مزے
یاد ہیں وہ حُسنِ اُلفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہید شکایت کے مزے
جلوۂ ہستی فزائے دلربا کی لذتیں
بیخودی ہائے دلِ مخمور حیرت کے مزے
یاد ہیں وہ آرزو ہائے لقائے یار ہیں۔
کشمکش ہائے شبِ تاریک فرقت کے مزے
شوق عرضِ آرزو کے وہ نرالے ولولے
فکر مضمون ہائے عنوان کتابت کے مزے
یاد ہیں وہ انتظارِ نامۂ محبوب ہیں
بیقراری ہائے ناکامِ طبیعت کے مزے

صحبتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
جس میں آئے بار ہا انکی عیادت کے مزے
وہ زمانہ بھی غرض تھا۔ کیا زمانہ لطف کا
دل کو جب حاصل تھے۔ سارے عیش و عشرت کے مزے
لیکن حسرت اس تغافل کیش کے بیداد نے
بدلے سب محرومیوں سے وہ محبت کے مزے

حسرت موہانی (از علیگڈھ)

شعاعِ آفتاب

(۱۱)

صبح جب میری نگہ سودائیٔ نظارہ تھی
آسماں پر اک شعاعِ آفتاب آوارہ تھی
میں نے پوچھا اس کرن سے اے سراپا اضطراب!
تیری جانِ ناشکیبا میں ہے کیسا اضطراب!
تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے کہ جس کو آسماں
کر رہا ہے خرمنِ اقوام کی خاطر جواں!
یہ تڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے کیا ہے یہ؟
رقص ہے؟ آوارگی ہے؟ جستجو ہے؟ کیا ہے یہ؟
خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستیٔ خاموش میں
پرورش پائی ہے میں نے صبح کی آغوش میں
مضطرب ہر دم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے
جستجو میں لذتِ تنویر رکھتی ہے مجھے
برقِ آتش خو نہیں فطرت میں گو ناری ہوں میں
مہرِ عالم تاب کا پیغامِ بیداری ہوں میں!
سرمہ بن کر چشمِ انساں میں سما جاؤنگی میں
رات نے جو کچھ چھپا رکھا تھا دکھلاؤں گی میں
تیرے مستوں میں کوئی جویائے ہشیاری بھی ہے؟
سونے والوں میں کسی کو ذوقِ بیداری بھی ہے؟

عرفی

(۱۱)

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
میسر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشکِ عنابی

مرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بیتابی

مزاجِ اہلِ عالم میں تغیر آگیا ایسا
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی

فغانِ نیم شب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطفِ بیخوابی

کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر؟
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

صدا تربت سے آئی "شکوۂ اہلِ جہاں کم گو
نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی"

چاند

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن

قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو؟
زرد رو شاید ہوا رنجِ رہ منزل سے تو؟

آفرینش میں سراپا نور تو، ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں

آہ! میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے

ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہے

زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو، حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے، سوزاں ہوں میں

میں رہِ منزل میں ہوں، تو بھی رہِ منزل میں ہے
تیری محفل میں جو خاموشی ہے، میرے دل میں ہے

تو طلب خو ہے، تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا نور ہے

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو، تنہا ہوں میں

مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغام اجل
محو کر دیتا ہے مجکو جلوۂ حسن ازل

پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہو وہ پہلو اور ہے!

گرچہ میں ظلمت، سراپا ہوں، سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے!

(اقبال)

بچّہ کی قبر

(۱۲)

بیخبر ماں تجھ کو اس بچے کی بھی ہے کچھ خبر — گود میں تیرے ہمکتا تھا جو کل تک بار بار
گوری گوری اسکی وہ رنگت وہ مکھڑا چاند سا — اور وہ صورت کہ جس پر رات دن تھی تو نثار
کل بلائیں لیتی تھی تو دیکھ کر انداز خواب — آج کیوں آتا نہیں سونے پہ اسکے تجھکو پیار
اُف وہ دہشتناک جنگل اور اندھیاری وہ رات — آہ وہ معصوم بچہ اور وہ کنجِ مزار
بے خبر بے دیکھ ڈر جائے نہ وہ بچہ کہیں — کیا اسے آغوش میں لینا ہے تجھ کو ننگ عار
کیا ہوئی وہ تیری اُلفت کیا ہوئی وہ ماتا — کیوں نہیں اسکے لئے دل آج تیرا بیقرار
اپنے سینہ سے لگا کر تو سُلاتی تھی جسے — آج وہ ہے اور ایک کنجِ لحد تاریک و تار
آج لپٹے ہیں اسی میں چند کیڑے قبر کے — جس گلے میں تو نے پہنائے تھے تعویزوں کے ہار
ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے اٹا سب خاک میں — ہائے وہ پیکر جو کل تک تھا ترے زیب کنار

جب تری آواز سنتا تھا مچل جاتا تھا وہ — آج وہ ہے اور خموشی چاہے لاکھ اُس کو پکار
اک اشارے سے کسی کے ہوگئی ہے آج بند — اس کی وہ آواز جو تھی رونقِ صوتِ ہزار
جس کو پہنایا تھا تو نے جامۂ گل دوز کل — آج اس کے تن پہ کیڑوں نے کیے نقش و نگار

زندگی میں تو ہر اک عیب و ہنر پر تھی نظر
دیکھ لے یہ حال بھی جا کر بچشمِ اعتبار

عزیز لکھنوی

انسان کی فریاد

(۱۳)

ہاں اے مصافِ ہستی! مت پوچھ مجھ سے کیا ہوں! — اک عرصۂ بلا ہوں! اک لقمۂ فنا ہوں!
نے مجھ کو جائے ماندن نے مجھ کو پائے رفتن — میں راندۂ قدر ہوں - آوارۂ قضا ہوں!
مجبوریوں نے ڈالا گردن میں میری پھندا — خو کردۂ وفا ہوں جاں دادۂ رضا ہوں
جو میری حاجتیں ہیں ساری مصیبتیں ہیں — نکبت کی ابتدا ہوں شامت کی انتہا ہوں
صیادِ حادثے کا کرتا ہے میرا پیچھا — مُرغِ بُریدہ پر ہوں صیدِ شکستہ پا ہوں
ہے ذات میری مجمع ساری برائیوں کا — کہنے کو میں بڑا ہوں لیکن بہت بُرا ہوں
آزادیوں کی مجھ پر تہمت ہی ہے سراسر — مَیں قیدیِ ہوس ہوں میں بندۂ ہوا ہوں
اک بات ہو بتاؤں اک درد ہو سناؤں — روؤں بھلا کہاں تک کبتک پڑا کراہوں
فریاد کی اجازت مجھ کو نہ تاب و فرصت — ظاہر ہمہ خموشی - باطن ہمہ بکا ہوں

کمبخت دل کچھ ایسا میں ساتھ لے کے آیا — اِک لمحہ جس کے ہاتھوں دنیا میں سکھ نہ پایا
جو جوش اس میں اُٹھا حالات نے دبایا — جو شعلہ اس میں بھڑکا تقدیر نے بجھایا
اُمید کا یہ غنچہ کھلتے کبھی نہ دیکھا — یہ آرزو کا پودا پھلتا نظر نہ آیا
دلسوزیٔ خلایق سو بار اس میں امڈی — ابرِ جنونِ اُلفت سو بار اس میں چھایا
عزمِ رہِ اُخوت ہر اک طرح سے ٹھانا — فیاضیوں کا بیڑا سو سو طرح اُٹھایا

گو اس میں موج زن تھی قوم و وطن کی اُلفت — لیکن غرض نے اس کو کچھ اور ہی سکھایا
ہوتی نہیں رسائی اُمید کے افق تک — طولِ امل نے اسکو اک جال میں پھنسایا
جو آرزو ہے اس کی ناکامیٔ ابد ہے — ارمان اس کا حرماں اُمید اس کی مایا
پائی نہ وائے اس نے طاقت بقدرِ ہمت — بے اختیاریوں نے یہ روزِ بد دکھایا

کی رہبرِ خرد نے ہر چند رہنمائی — اِس جہد پر بھی لیکن کھلتی نہیں سچائی!
پایا نہ میں نے ابتک مقصد کا اپنے ساحل — کی بحرِ معرفت میں دن رات آشنائی
اس جستجو میں میں نے کی سیرِ طور و ایمن — پربت کو گھر بنایا جنگل سے لو لگائی
مندر کو جا کے دیکھا گرجا میں جا کے ڈھونڈھا — مسجد کو چھان مارا اس کی نہ دید پائی
جوگی کا روپ دھارا بن میں کیا گذارا — تن پر بھبھوت مل کر دھونی بہت رمائی
جب تپ میں عمر اپنی کی میں نے بِیتر اکثر — بن بن کے پیر راہب جا خانقہ بسائی
صوفی بھی بن کے دیکھا اور رندِ بے ریا بھی — کر نعرۂ انا الحق اک کھلبلی مچائی
پھرتی ہیں ماری ماری مشتاقِ جلوہ آنکھیں — پر اک جھلک سے بڑھ کر دیتا نہیں دکھائی
بیفائدہ ہے ساری یہ عقل کی تگاپو — تا منزلِ حقیقت ممنوع ہے رسائی

اُٹھ جا نظر سے میری ہاں اے حجابِ ہستی! — حُسنِ ازل نہاں ہے زیرِ نقابِ ہستی،
یہ زندگی انساں اک خواب ہے پریشاں — بیداریٔ عدم ہے تعبیرِ خوابِ ہستی،
میں چاہتا ہوں ساقی! نشۂ مئے فنا کا — بیگانۂ خرد ہے مستِ شرابِ ہستی،
طالب ہوں اب سکونِ دنیائے نیستی کا — یہ کشمکش کہاں تک اے اضطرابِ ہستی!
دیکھیں اگر تو کیونکر ہم جلوۂ معارف — تو ظلمتِ نظر ہے اے آفتابِ ہستی!
تسکیں کو زہرِ قاتل آب و ہوائے عالم — راحت کا دشمنِ جاں ہر انقلابِ ہستی،
یہ میرے دِل کی حالت یہ میری روح کی گت — کہلاؤں کس صفت پر میں انتخابِ ہستی،
اے تشنۂ حقیقت دھوکے میں تو نہ آنا — اِک دام پر خطر ہے موجِ سرابِ ہستی،

چاہے اگر رہائی پیش از فنا فنا ہو
پاداشِ جرمِ ہستی ہے یہ عذابِ ہستی

تلاشِ محبّت

(ایک بلّی کے بچّے کو دیکھکر)

اسقدر بیچین کیوں پھرتی ہے اے ننھی سی جان!
شور ہے سر پر اُٹھا رکھا ہے کیوں سارا مکان!

دُودھ پی لے بھوک نے تجھ کو ستایا ہے اگر
وُہ دھرا ہے دُودھ چھوٹی سی پیالی میں اُدھر

دُودھ بھی پیتی نہیں تو؟ خیر لے تیرے لئے
گوشت تھوڑا سا منگا رکھا ہے یہ بازار سے

گوشت کو بھی تو نہیں چھوتی؟ تو کوئی کیا کرے؟
ہاں! ستایا ہے کہیں سردی کی شدّت نے تجھے

آ زانوئی میں تجھے اپنی بٹھا لیتا ہوں مَیں
آ تجھے سردی کے حملے سے بچا لیتا ہوں مَیں

پر یہاں بھی بیٹھکر تجھ کو کہاں آرام ہے؟
تلملانے سے تڑپنے سے یہاں بھی کام ہے

بیٹھکر گھٹنے پہ غُرغُر کرنے لگتی ہے کبھی
سر کو میرے پاؤں پر تو دھرنے لگتی ہے کبھی

پیار کرتا ہوں تو اس پر بھی نہیں تجھ کو قرار
ناشکیبائی ہے تیری حرکتوں سے آشکار

کسقدر اُلفت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری!
ہائے کیا حسرت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری!

ہائے اے ناداں! اب سمجھا میں تیرا مُدّعا
تو تلاشِ مہر و اُلفت میں ہے آتش زیرِ پا

ڈھونڈھتی پھرتی ہے ہاں وہ گوہرِ نایاب تُو
جسکی ہے انساں کو ہمجنسوں میں ناحق جُستجو

تجھ کو لو جس چیز کی ہے ابنِ آدم میں نہیں
بلکہ سچ پُوچھے تو موجوداتِ عالم میں نہیں

آئیگا تیری سمجھ میں کس طرح یہ فلسفہ؟
ذوقِ راحت ہے تو پیدا کر دلِ بے مُدّعا

ہے تمنّائے محبّت ایک نخلِ بے ثمر
آرزوئے مہر و اُلفت ایک شام بے سحر

بُلبلِ شیدا ہوئے گُل میں صرف نالہ ہے
داغِ مہرِ گل سے دِل اُسکا برنگِ لالہ ہے

ہے دلِ بُلبل میں گل کی سرد مہری کی جلن؟
کیا خبر اُسکو کہ گل کے دل میں ہے کس کی لگن

کس کی فرقت میں گلِ تر اس قدر غمناک ہے
چشمِ پُرنم ہے، جگر خوں ہے، گریباں چاک ہے

چاند پر ناحق فنا کرتا ہے جاں اپنی چکور
چاند کب سنتا ہے اُس مہجور کے نالوں کا شور

مسکراہٹ چاندنی ہے اسکے نالوں کا جواب
اس طرف اتنا سکوں اور اس طرف یہ اضطراب

آتشِ اُلفت ہی برقِ خرمنِ پروانہ ہے
یہ پتنگا بھی ادائے شمع کا دیوانہ ہے

گرد پھر پھر کر طوافِ کعبۂ اُلفت کرے!
جان دے اور آتشِ ذوقِ فنا میں جل مرے!

شمع کو لیکن نہیں اس کی محبت کی خبر
وہ ذرا اس پر نہیں کرتی عنایت کی نظر

کونسی دھن میں خدا جانے وہ ہے آتش بجاں
کس لئے ہیں گرم آنسو اسکی آنکھوں سے رواں

جب محبت کا یہ عالم ہے تو کیا اسکی تلاش؟
کیا تمنائیں کہاں کی آرزو کس کی تلاش؟

عاشق از بے مہری یار جفا جو شکوہ سنج
یار در فرط ہوائے دیگرے پامال رنج

نیرنگ

اندھی پھول والی کا گیت

(۱۴)

لوگو چلو میرے گل رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو

منتی ہوں اس زمین کا ہے منظر نظر فریب
پھر کس طرح نہ ہوں یہ گل تر نظر فریب

سمجھے یہ پھول بھی تو اُسی سرزمیں کے ہیں
یہ ننھے ننھے لال اُسی نازنیں کے ہیں

بازار حُسن میں یہ گل تر ابھی ابھی
آئے ہیں ماں کی گود سے اُٹھ کر ابھی ابھی

سوتا ہوا چمن سے اُٹھا لائی ہوں ابھی
پھولوں کی انجمن سے اُٹھا لائی ہوں ابھی

لوری تھی خواب ناز کی موج ہوا نہ تھی
ماں کی دعا تھی جنبش باد صبا نہ تھی

دلکش ہیں ان کے پھول سے رخسار کے نشان
کچھ ماں کی ماتا کے ہیں کچھ پیار کے نشان

آنسو ڈھلک رہے ہے جو یہ چہرے پہ ماں کے ہیں
خطرہ نہ کر یہ شبنم باغ جنان کے ہیں

ان آنسوؤں میں رنگ محبت ہے جلوہ ریز
ان بوندیوں میں شعلۂ الفت ہے جلوہ ریز

بچوں کا غم خوشی میں بھی ہے غم نصیب کو
کھٹکا لگا ہوا ہے یہ ہردم غریب کو

یارب کہیں انہیں نہ کسی کی نظر لگے
ہیں نازنین انہیں نہ کسی کی نظر لگے

آغوش ناز سے میرے ہو کر اُٹھے ہیں یہ
شبنم سے ہاتھ منہ ابھی دھو کر اُٹھے ہیں یہ

ہو کر بڑے اُٹھے یہ حسین کس غضب کے ہیں
جھڑتے ہیں پھول خندہ جبیں کس غضب کے ہیں

روتی گلے لگا کے ہے بے اختیار ماں
کرتی ہے ان پر قطرۂ شبنم نثار ماں

شبنم کی بوندیاں ہیں کہ آنسو یہ ماں کے ہیں
سرچشمۂ وفا ہیں یہ قطرہ کہاں کے ہیں

تاریک ہے یہ بزم تماشا میرے لئے
ظلمت کدہ ہے محفل دنیا میرے لئے

آنکھوں بغیر سب ہیں مظاہر جہاں کے ہیچ
میرے لئے ہیں آہ مناظر یہاں کے ہیچ

دنیا کی صورتوں کو میں دیکھا ترستی ہوں
اُجڑی ہوئی صداؤں کی منزل میں بستی ہوں

گویا قریب ساحل ظلمت کھڑی ہوں میں
محو تلاش جلوہ صورت کھڑی ہوں میں

نکلینگی ان میں ایسی بھی دو چار صورتیں
صبر آزما۔ حسین۔ طرحدار صورتیں

صورت پہ جنکی خلق خدا ہے مٹی ہوئی
ناز و ادا پہ جنکے قضا ہے مٹی ہوئی

وہ کیسی ہوتی ہونگی ترستی ہوں میں غریب
دیکھوں نظر اُٹھا کے میں ایسے کہاں نصیب

میرا بجز صداؤں کے ہمراز کون ہے
ظلمت کدے میں مونس و دمساز کون ہے

لوگو چلو میرے گل رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو

کہتے ہیں کیا غریب یہ انکی صدا سنو
فریاد کو ہے اپنی زبان بھی ذرا سنو

اس اندھی پھول والی کا دم ہے ستم ہمیں
مرجھا کے رہ نہ جائے کہیں ہے یہ غم ہمیں

نازک ہے دھان پان ہے بیچی ہے نور کی
پروردۂ بہار ہے بیچی ہے نور کی

آزاد اسکی قید ستم سے کرے کوئی
دامان شوق میں ہمیں یارب بھرے کوئی

ہم دایہ بہار کے نور نگاہ ہیں
آنکھیں اس اندھی لڑکی کی بے نور آہ ہیں

مشتاق ہیں ان آنکھوں کے پروردگار ہم
جو ہم کو دیکھیں جنکو دکھائیں بہار ہم

لوگو چلو اے گل رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو ؏

سرور

ذکر شباب

(۱۵)

: قطعہ :

عمر انسان میں جوانی گرچہ ہے ہر دل عزیز
اور باغ زندگی کی ہے یہی فصل بہار
لیکن اپنی بے ثباتی میں یہ ہے ضرب المثل
مثلِ خواب خوش نہیں اک رات بھی اسکو قرار

یاد آیا میسکہ تھی اپنی جوانی کی نمود
ہائے وہ عالم کہ اپنا بھی تھا زندوں میں شمار
صبح تھی صبح تمنا شام تھی شام مراد
طالع بیدار تھا کالشمس فی نصف النہار

دل میں جودت تھی طبیعت میں اُمنگیں موجزن
چڑھتے دریا کی طرح جوشِ جوانی آشکار
آنکھ پڑتی جس طرف دنیا نظر آتی بہشت
دامنِ دل کھینچنے کو حُسن دل رکھتے تھے خار

دل کے جوش عشق سے اک بحر طوفان خیز تھا
روکنے سے رک نہ سکتا جذبۂ بے اختیار
جمگھٹے تھے لعبتان حور وش کے گرد و پیش
حُسن آفت خیز پر جن کے دل عالم نثار

بھولی بھالی پیاری پیاری اُنکی دلکش صورتیں
لوٹ لے جاتیں دلوں سے مایۂ صبر و قرار
بانکی بانکی وہ ادائیں تیر و خنجر کی طرح
ترچھی ترچھی وہ نگاہیں مثل تیغ آبدار

ایک خنجر تھا نیام ناز سے نکلا ہوا۔
انکی چشم نرگسیں میں سُرمۂ دنبالہ دار
شوخیوں میں وہ ادائیں تھیں کہ بجلی مات تھی
گفتگو میں وہ شرارت تھی کہ اُڑتے تھے شرار

جسم وہ نازک اٹھا سکتے نہ جو بار نظر
آنکھ بھر کر دیکھنا بھی تھا کسی کا ناگوار
سحر تھا نغموں میں اُنکے نور کے اُنکے گلے
تان لیتے تھے تو ہو جاتے تھے ناوک دل کے پار

مجمع یاران صادق اور بھی دیتا تھا لطف
خون جو اپنا بہاتے تھے پسینے کی جگہ
نام پر جن کے وفاؤ دوستی ہوتی نثار
جنکا مذہب تھا محبت دوستی جنکا شعار

شعلۂ اُلفت تھا جنکے دلمیں یکساں مشتعل
ظاہر و باطن تھا یکساں صاف مثل آئینہ
شمع ساں دلسوز تھے قربان تھے پروانہ وار
منہ پہ کہدیتے تھے کچھ دلمیں جو آتا تھا غبار

الغرض تھی ہر طرف ارزانی عیش و نشاط
دن تھے اپنے عید کے دن اپنی راتیں شب برات
جام زریں میں چھلکتی تھی شراب خوشگوار
روز رہتی تھی عروسِ کامرانی ہمکنار

کیا زمانہ تھا موافق طالع بیدار سے
دل کی قوت سے ارادے ہو رہے تھے کامیاب
چلتی تھی اپنے اشاروں پر ہوائے روزگار
سہل اپنے سامنے تھی ہر رہ مشکل گذار

دفعتہً ایسی ہوا بدلی کہ ٹوٹا وہ طلسم
اُڑ گئے باغ طرب سے سب حسین بلبل کی طرح
ہوگئی صرف خزاں باغ جوانی کی بہار
غنچۂ و گل کے عوض کانٹے ہیں یا گرد و غبار

صحبت یاراں ہمدم ہوگئی خواب و خیال...
اب وہ باتیں ہیں نہ وہ راتیں نہ وہ دلکی امنگ
اُٹھ گئے دنیا سے کتنے ہی رفیق و دوستدار
ہر گھڑی ہے فکر دُنیا اور ہجوم کاروبار....

شادمانی و مسرت سے جو دل لبریز تھا
دل ہے تربت داغ دل ہے شمع تربت کیطرح
اب وہی ہے حسرت مُردہ کا گویا اک مزار
طبع افسردہ ہے مُردہ حسرتونکی سوگوار...

عالم امکاں ہے گویا اِک تغیر کا طلسم
شام ہے لاریب دیباچہ کتاب صبح کا
ایک حالت پر نہیں کیفیت لیل و نہار۔
صبح ہے اک دفتر بے معنی و بے اعتبار۔

باغ عالم کی فضا سے دل لگائے کیا کوئی
ہائے مثل غنچہ کھولی تھی کہ آپہنچی خزاں
موسم گل چند روزہ زندگی ناپائدار۔
اِک گُل پژمردہ ہو کر رہگیا جسم نزار۔

اُس زمانے کی نہیں اب کوئی شے باقی مگر
غم غلط کرنیکو ہے اک طبع موزوں یادگار
شاعری جسکو سمجھتے تھے ہم اک شوق فضول
اب دل اندوگہیں کی اِک وہی ہے غمگسار

یادِ ایامِ جوانی جب ستاتی ہے بہت
شعر کہنے میں نکل جاتا ہے کچھ دل کا بخار
طبع میں ہے شعر گوئی سے جو اک وارستگی
برق کی صورت نہیں دم بھر کہیں دلکو قرار

خانہ بردوش صبا رہتا ہوں مثل بوئے گل
اپنی ہی خوشبو سے جیسے مست آہوئے تتار
خواب سا دیکھا تھا ہمنے ہاں جوانی خواب تھی
خواب بھی ایسا نہیں تعبیر جس کی ذی نہار

نظر لکھنوی

مرحومہ کی یاد

(۱۴)

(ترجمہ از "آئرش میلوڈیز" مصنفہ ٹامس مور)

رات کے پچھلے پہر روتی ہیں جب چشم نجوم
اُلفتِ دیرینہ کی وادی میں اُڑجاتا ہوں میں
اور اس وادی میں مرحومہ جو یاد آتی ہو تم
محو ہوجاتا ہوں کچھ ایسا مزا پاتا ہوں میں

وہ مکاں وہ قصر وہ تم وہ تمہاری حسرتیں
وہ گلے وہ عذر وہ گذری ہوئی دلچسپیاں
دیر تک کرتا ہوں میں یاد آہ اُن ایام کو
ہائے وہ راتیں کہاں وہ دن کہاں تم کہاں

اس سکوت اس محویت میں پھر یہ آتا ہے خیال
روحیں منڈلاتی ہیں گرد وج فضائے عرش پر
اور چھپکر آتی ہیں اس خاکدان عشق میں
تاکہ دیرینہ علایق دیکھ لیں پھر اک نظر

ق

شاید آجائے تمہاری رُوح بھی اور یہ کہے
کیا بتاؤں جنت الماوی میں میں کیسی رہی
اس جُدائی میں رہا میرا تمہارا ایک حال
تم یہاں روتے رہے اور میں وہاں روتی رہی

پھر سراپا شوق ہو کر وہ غزل گاتا ہوں میں
تم جو تنہائی میں چپکے چپکے گاتی تھیں کبھی
گونج کر جب نغمہ ٹکراتا ہے تو کہتا ہوں میں
یہ تمہاری رُوح مضطر آتی ہے گاتی ہوئی

یہ لب و لہجہ وہی ہے یہ سُریلا پن وہی
لیکن اب اس میں تو کچھ کچھ ضعف کا انداز ہے
اور پھر کچھ سوچکر پہچان کر کہتا ہوں میں
یہ وہی آواز ہے - بیشک وہی آواز ہے

نادر کاکوروی

رامچندرجی ماں سے رخصت ہوتے ہیں

(۱)

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ خوش خصال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زبان کی طرح بولنے لگا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو میری جاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جاں کو ساماں یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بنکے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم

میں خوش ہوں پھونکدے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں کی راج کو

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالق عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سنکر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز
اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بیکس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور
لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعدِ سفر وطن میں ہم آئیں گے شادکام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انہیں گراں
لیکن جو رنگِ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار
موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار
وہ ابر و برف و باد میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو ربِ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ، سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بیخبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

چکبست

بارش

(۱۸)

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی
آفتاب اوڑھے ہوئے تھا چادرِ ابرِ سیاہ
برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ
بادل اتنے میں دُرِ ناسفتہ برسانے لگے
داستانِ قلزم و عمان کو دُہرانے لگے
جھوم کر اُٹھی گھٹا۔ برسی برس کر پھٹ گئی
گرد کی چادر زمیں کے مُنہ سے فوراً ہٹ گئی
بادلوں سے نورِ خورشید اس طرف چھننے لگا
سائباں قوسِ قزح کا اُس طرف تننے لگا
سبزہ زاروں میں کلیلیں کرتے پھرتے تھے ہرن
تھا دہا بن کا ہر اک کو نافتن اندر ختن
جنگلوں میں مست ہو کر ناچتے پھرتے تھے مور
کوہساروں میں چکوروں نے مچا رکھا تھا شور
ڈھل کے پہنچا تھا اُفق کے آسماں تک آفتاب
تھی شفق کی اس کے مُنہ پر ایک نارنجی نقاب
یہ نظر آرا مناظر تھے کچھ ایسے دل فریب
ہاتھ سے جاتا رہا دل میرے اور دل سے شکیب
عالم از خود رفتگی کا مجھ پہ طاری ہو گیا
جوشِ مستی کا مری ہر رگ میں ساری ہو گیا

ظفر علی خاں

پروانہ

(۱۹)

آفریں! ننھے سے کیڑے آفریں! یہ ذرا سی جان یہ عشقِ آتشیں
بڑھ گیا فرہاد و مجنوں سے کہیں تیرے مرنے کی ادا ہے دِل نشیں
شکوۂ حُسن تغافل کیش کیا
جز فنائے عشق بیش از بیش کیا

شہپرِ ذوق فنا پر اُڑ چلا سوزِ اُلفت کی ہوا پر اُڑ چلا
عِشق کے اوجِ سما پر اُڑ چلا اُڑ چلا راہِ وفا پر اُڑ چلا
گھر سے نِکلا جستجوئے یار میں
تا کہ گُم ہو جائے کوئے یار میں

اُڑتے اُڑتے آن پہنچا شمع پر وہ جُھلس کر رہ گئے نازک سے پر
ہوگیا افسانۂ غم مختصر جل بُجھا بے شکوۂ سوزِ جگر
حُسن کے شُعلے سے لپٹا آن میں
جینے مرنے کو نہ لایا دھیان میں

اُف! یہ تیرا تھرتھرانا گردِ شمع اِضطرابِ عاشقانہ گردِ شمع
یہ ترا چکر لگانا گردِ شمع ہے طوافِ مُخلصانہ گردِ شمع
شام کو چھپ چھپ کے یہ آنا ترا
چپکے چپکے ہائے! جل جانا ترا

بسکہ ہے دلدادۂ سوزِ وفا ہوگیا ہے بہرہ اندوزِ وفا
ظُلمتِ شب تجھ کو نوروزِ وفا تیرا جلنا طلعت افروزِ وفا
یہ تیرے ننھے سے پر پتلے سے بال
ہیں سراپا دفترِ شرحِ وصال

عشق پروانے کا ہے باقی ہوس جسکو جلنے میں نہیں کچھ پیش و پس
بوالہوس لاکھوں ہیں یاں مثلِ مگس ہیں وہ شہرِ عشق میں خاشاک و خس

ایسے عاشق ہر جگہ ہیں خیل خیل
عاشقی بدنام ہے جن کے طفیل

اے کہ تجھ کو آرزوئے عشق ہے
شامۂ سرمست بوئے عشق ہے

جانتا بھی ہے جو خوئے عشق ہے
مشہدِ عشاق کوئے عشق ہے

شمع پر پروانے کو دیکھا نہیں
عشقبازی کھیل بچوں کا نہیں

سیکھ پروانے سے آئینِ وفا
جس کا جل بجھنا ہے تلقینِ وفا

شمع خود ہے پیرو دینِ وفا
قدردان و منزلت بینِ وفا

ساتھ ڈھلتی رات کے ڈھلتی ہوئی
تا سحر روتی ہے یہ جلتی ہوئی!

دِل میں پیدا ہمتِ پروانہ کر
ورنہ مُرغِ شوق کا پر۔ وانہ کر

رازِ پنہانی کسی پر۔ وانہ کر
اپنی ہستی کی ذرا پروا۔ نہ کر

دِل کو تُو پہلے جلا۔ پھر آپ جل
عشق کا دعویٰ ہے۔ تو چُپ چاپ جل

بچّہ

ایکہ اپنے ساتھ گھر بھر کی خوشی لایا ہے تُو
کس وطن کی یاد میں روتا ہوُا آیا ہے تُو؟

کون سی دنیائے خنداں یاد آتی ہے تجھے؟
رونے والے! یاد کس کس کی رُلاتی ہے تجھے؟

کیا کوئی زرّیں جزیرہ چھوڑ کر آیا ہے تو؟
گلشنِ فردوس سے مُنہ موڑ کر آیا ہے تُو؟

یاد ایسے ہی تو کچھ آتے ہیں نظارے تجھے
اجنبی سے اس جہاں کے نقش ہیں سارے تجھے

کس لئے حیرت سے یُوں ہر اک کا مُنہ تکتا ہے تُو
کچھ تو کہنا چاہتا ہے کہہ نہیں سکتا ہے تُو

ہم کو بھی معلوم ہے، تو ہے مسافر دُور کا
مطلقاً اس دیس کی بولی سے ہے نا آشنا!

ہاں! بتا، وہ سرزمین عافیت تھی کونسی / بستی ہے دلمیں تیرے دلکش وہ بستی کونسی؟
روشنی ہوتی ہے کیسی چاند سُورج کی وہاں؟ / تیرے چہرے پر ہویدا ہیں ابھی جسکے نشاں!
کس چمن کا گل ہے تو؟ کس عرش کا تارا ہے تو؟
کسقدر ہے پاک و روشن! کسقدر پیارا ہے تو!

آہ! اے نو وارد ہستی! ابھی تجھے معلوم کیا / انقلابات زمانہ ہیں مچاتے دُھوم کیا
آج تو روتا ہے جس دنیا کو زنداں جانکر / کل نہ چھوڑیگا اسی کو باغ رضواں جانکر
اسقدر مانوس ہو جائیگا اس دُنیا سے تو / پھر وطن کی یاد ہوگی اور نہ اُسکی آرزو
یاد بھولے سے نہ آئیگا تجھے اپنا وطن / تو سمجھ لیگا اسی غربت کو ہی پیارا وطن
حاصل اکدن بھی نہ ہو گا گرچہ اطمینان دل
پھر بھی دنیا ہی رہیگی شامل ارمانِ دل!

محروم

چاندنی رات

(۲۰)

رات چھٹکاتی ہے تارے صبح برساتی ہے نور / موسم باراں بچھا دیتا ہے سبزہ دُور دُور
چاندنی شب بھر دکھاتی ہے ضیائے روئے حُور / ذرہ ذرہ صبح کو کہتا ہے میں ہوں برق طُور
رات، زلفیں کھولدیتی ہے سلانے کے لئے
تاج پہنے صبح، آتی ہے جگانے کے لئے

لہریں ہنس ہنس کر عجب نغمے سناتی ہیں مجھے / ڈالیاں پھولونکی جُھک جھک کر بلاتی ہیں مجھے
شاخیں اپنے سائے میں پہروں بٹھاتی ہیں مجھے / ندیاں اپنے کناروں پر سلاتی ہیں مجھے
کوئی مجھ کو رنج ان احباب میں دیتا نہیں
اور اس خدمت کی قیمت بھی کوئی لیتا نہیں

دیکھتے ہیں مجھ کو پہروں خندہ پیشانی سے پھول / کسقدر مانوس ہیں آئین مہمانی سے پھول
ٹوٹ کر دامن میں آجاتے ہیں آسانی سے پھول / کرتے ہیں مسرور مجھکو اپنی قربانی سے پھول

پھول کے مانند انسانو، تمہارا دل نہیں
میری خاطر جان بھی دینا انہیں مشکل نہیں
گونجتی ہے کوہ وصحرا میں پپیہے کی صدا
اُودی۔ اُودی آسمانوں پر جب آتی ہے گھٹا
روح کو بیدار کرتی ہے بیاباں کی ہوا
دُور ہوتی ہے خودی، سینے میں آتا ہے خدا
کام رہتا ہے نہ دولت سے نہ خانی جاہ سے
لو لگا کر بیٹھ جاتا ہوں فقط اللہ سے
صاف دل ہو جا، مجھے تعلیم یہ دیتی ہے نہر
ندیوں کے پیچ وخم سے خون میں آتی ہے لہر
دشت ہنستے ہیں کہ آبادی پہ کیوں نازاں ہیں شہر
آب حیواں جسکو سمجھے ہیں وہ ہے اک موج زہر
سوز دیتا ہے بھری برسات کا دریا مجھے
عقل دیتا ہے گھنے جنگل کا سناٹا مجھے
نقرئی چادر بچھاتا ہے ہمہ سیمین بدن
چومتی ہے آکے پیشانی مری زرّیں کرن
دیکھکر شاداب ہوتا ہے مجھے صحن چمن
کسقدر خوش ہوں کہ جنگل ہے مرا پیارا وطن
روز صحرا کی طرف جانا مرا دستور ہے
بستیوں میں ہوں "مگر میری قرابت دور ہے"!!!

جوش

پیارا پیارا گھر اپنا

(۲۱)

وہ چین کہاں اپنے گھر کا وہ بات کہاں اپنے گھر کی
پیارا پیارا گھر اپنا
وہ راج کہاں اپنے گھر کا وہ رات کہاں اپنے گھر کی
آنکھوں کا تارا گھر اپنا
سُکھ چین اگر دنیا میں ہے اپنے ہی گھر میں ملتا ہے
سُکھ کا سہارا گھر اپنا

دُکھ درد کی گر کوئی دوا ہے اپنے ہی گھر کی سیوا ہے
دُکھ کا مداوا گھر اپنا
وہ گھر والی سندر چترا گھر کی سیوا کرنے والی
دل کا دلاسا گھر اپنا
آرام ہمیں دینے والی آپ مصیبت بھرنے والی
جان سے پیارا گھر اپنا
آنکھوں کے تارے لاڈلے گھر کے سب مل کر گھر سر پہ اُٹھاتے
دودھوں نہایا گھر اپنا
کھیلتے ہنستے روٹھتے منتے سنتے کہانی سوتے سلاتے
بسا بسایا گھر اپنا
ہم پر جان چھڑکنے والا وہ پروان جڑھانے والا
پالنے والا گھر اپنا
وہ نَبُوان بنانے والا وہ انسان بنانے والا
ڈھالنے والا گھر اپنا
وہ پاک ہوا اپنے گھر کی پیار کی جلا اپنے گھر کی
دل میں سمایا گھر اپنا
ایثار وفا اپنے گھر کی وہ درد دیا اپنے گھر کی
روح پہ چھایا گھر اپنا
جڑ بنیاد وطن کی گھر ہے وطن گھروں کا اپنے گھر ہے
اپنے گھروں کا گھر اپنا
اپنے گھر پہ نثار وطن ہے اور وطن کے صدقے گھر ہے
وطن کا شیدا گھر اپنا
وطن کی چاہت اپنے گھر سے وطن کی طاقت اپنے گھر سے
وطن کا پیارا گھر اپنا
وطن کی دولت اپنے گھر سے وطن کی عزت اپنے گھر سے
راج دلارا گھر اپنا

محمد عظمت اللہ خاں

عظمتِ وطن

(۲۲)

وہ جاں بخشی ہے اے باغِ وطن تیری بہاروں میں
نظر آتی نہیں روئے زمیں کے لالہ زاروں میں!
ازل سے ہے لقب گہوارۂ شائستگی تیرا
رہی ہے کھیلتی تہذیب تیرے مرغزاروں میں
وہ نغمے مدتوں سے ہیں گنواروں کی زبانوں پر
جو خوابیدہ ہیں سازِ منطقِ مغرب کے تاروں میں
ہر اک ذرہ ترا معمورۂ نورِ تقدس ہے
کروڑوں مہرِ عالمتاب ہیں تیرے غباروں میں
ترے گردوں کی شانِ دلفریبی اور ہی کچھ ہے
وگرنہ روشنی موجود ہے ہر جا ستاروں میں

آنسو

پاتا ہے پرورش صدفِ چشمِ زار میں!
دریائے غم کا ہے گہرِ آبدار تو
نوکِ مژہ پہ کھلتا ہے تیرا حسب نسب
کانٹا یہ وہ ہے جس میں تلا بار بار تو
تیرا وجود حالِ طغیانِ اشتیاق!
طوفانِ اضطراب کا سرمایہ دار تو
اگلی مصیبتوں کا تو اک پیشِ خیمہ ہے
پچھلی مسرتوں کی ہے اک یادگار تو
قاصر زباں ہوتی ہے جب عرضِ حال سے
بنتا ہے ترجمانِ دلِ بیقرار تو

سیلِ زمانہ

تگ و تاز کی ہے تمنا مجھے
یہ طاقت نہیں لیکن اصلا مجھے
پھرا تو ہی کہسار و صحرا مجھے
چلا چل اٹھاتا گراتا مجھے
بہے جا بہائے لئے جا مجھے

جہاں کلفت و غم سے معمور ہے　　خوشی سات پردوں میں مستور ہے
میں درماندہ منزل بہت دور ہے　　بس اب پائے ہمت بھی معذور ہے
بہے جا بہائے لئے جا مجھے

ہے درپیش خوف و خطر چار سو　　تو مسدود راہِ مفر چار سو
نظر آ رہے ہیں بھنور چار سو　　پس و پیش زیر و زبر چار سو
بہے جا بہائے لئے جا مجھے

چلاتا رہا میں لگاتار ہاتھ　　مگر رہ گئے آخر کار ہاتھ
جو مارے بھی وقت سے پھر چار ہاتھ　　تو ہو جائیں گے تھک کے بیکار ہاتھ
بہے جا بہائے لئے جا مجھے

بہائے لئے جا مجھے پے بہ پے　　نہیں کوشش انساں کی کوئی شے
یہی اس زمانے کا دستور ہے　　اسی طرح ہوتا ہے یہ بحر طے
بہے جا بہائے لئے جا مجھے

توئی رہنما شاہ و درویش را　　نکوکار را ہم بد اندیش را
سپردم بتو مایۂ خویش را　　تو دانی حسابِ کم و بیش را
بہے جا بہائے لئے جا مجھے

مستحق بن اور خواہش کر

اے وفا اے نو اسیر حلقہ ہائے دام غم　　کس قدر حیرت تماشا ہے پریشانی تری
آہ تو ہے شکوہ سنج سختیٔ ایام غم　　زندگی ہے وقفِ کاوش ہائے پنہانی تری

آہ جن سے شکوۂ بے اعتنائی ہے تجھے　　سوچ تو اُن سے بھلا تجھ کو کوئی نسبت بھی ہے
آہ جن سے آرزوئے ہمنوائی ہے تجھے　　انکے آگے کچھ تری اے بوالعجب وقعت بھی ہے

پالتا ہے دل میں کیوں ان کی محبت کا خیال
ہاں ٹھکانا بھی کچھ آخر تیری نادانی کا ہے
تجھ کو اپنی شاعرانہ قابلیت کا خیال
اور رونا مجھ کو تیری ہیچ سامانی کا ہے

میں نے مانا تو دیا نتدار بھی ہے نیک بھی
شک دریں اے دوست خاکم در دہن نہا نیست
بسکہ تو بے عیب ہے تجھ میں نہیں عیب ایک بھی
لیکن ایں تنہا بمیدانِ عمل در کار نیست

خود کو تو احباب کے قابل بنانے کے لئے
آج ہی سے دل میں اے جان برادر عہد کر
یعنی اپنے آپ کو اونچا اُٹھانے کے لئے
گرم جوشی اور سرگرمی سے جد و جہد کر

میلا رام وفا

دیس کہانی

(۲۳)

کس شوخ کی برق نگاہی سے ہے ان بن شیخ و برہمن میں
آنکھوں میں سمائی ہے بجلی اور آگ لگی ہے دامن میں
کیوں نالے ہیں تیرے درد بھرے کیوں پھرتی ہے جنگل جنگل
کیوں تو نے چمن چھوڑا بلبل کیوں آگ لگائی گلشن میں
ہے قصۂ غم پونجی میری اور میں اک دہقان غارت گر
جو بوئے، سینچے، کاٹے اور پھر آگ لگا دے خرمن میں
ہے چال نرالی، بات نئی، ہوں تختۂ مشق جنوں میں بھی
پھرتا ہوں جہاں جی چاہتا ہے، بک جاتا ہوں جو ہو من میں
سینے میں سمایا ہے کوئی اور تیر نظر بھی مارے ہے
دل اور جگر کی ان بن سے اک آگ لگی ہے تن من میں
گر ان کو رکھو گے دل میں تو، موتی بن جائینگے اک دن
یہ شعر نہیں کچھ آنسو ہیں نکلے ہیں جو دل کی اُلجھن میں

ہندوستاں پیارے میں تجھ کو جانتا ہوں

اے مکتب حقیقت اے روح سازِ فطرت　　اے گلشن کو یرا رشیوں کی راجدھانی
ارجن کا زور بازو اور بھیم کی شجاعت　　رام اور لکشمن کی خاموش جانفشانی
وہ تیرے نیک بالک اور ان کی وہ اطاعت　　ہے جن کے دم سے قایم اتبک تری جوانی
وہ جذبۂ عبادت وہ عالموں کی سنگت　　وہ عالم مسرت وہ دور شادمانی
برمھو کی شان ہے تو اللہ ری تیری رفعت
ہے پست تیرے آگے طیب کی خوش بیانی
ہندوستاں پیارے میں تجھ کو جانتا ہوں

(۲)

کہسار و دشت و دریا سب تیرے پاسباں ہیں　　قدرت کے سارے جلوے اس دیس میں عیاں ہیں
فطرت کی کوششوں کا حاصل تری زمیں ہے　　زرخیز سارے جگ میں ایسی زمیں نہیں ہے
گودوں میں پربتوں کے سرسبز وادیاں ہیں　　رنگین پہاڑیوں پر کیا حسن باریاں ہیں
پرماتما کی رحمت ہے ندیوں میں بہتی　　روپوش بادلوں میں ہے شانتی کی دیوی
پتری ہمالیہ کی گنگا ہے نام جس کا　　سینوں کو پاک کرنا ہر دم ہے کام جس کا
ہو اس کا بول بالا کیا خوب ہے روانی　　وہ اُس کی پاک طینت وہ صاف صاف پانی
گوداوری و جمنا سندھ اور کاوری میں　　مے پیت کی بھری ہے بھارت کی نہری میں
ہے برف چوٹیوں پر دامن میں سبز جنگل　　سایہ فگن ہیں جن پر اندر کے مست بادل
دل چھیننے میں یکتا ہر مرغزار تیرا　　کیف خودی سے مضطر ہر آبشار تیرا
آب و ہوا میں تیری ہے شاعری جھلکتی　　دلکش پہاڑیوں سے ہے بے خودی ٹپکتی
قدرت نے بھر دئے ہیں امن و سکوں کے جوہر　　ہے راج شانتی کا تیری زمیں کے اوپر
تجھ میں کبھی بھری تھی علم و ہنر کی دولت
لبریز تھی حقیقت سے تیری دیو بانی
ہندوستاں پیارے میں تجھ کو جانتا ہوں

(۳)

جب آریوں نے تجھ کو اپنا وطن بنایا　　اس بحر پر سکوں کو پھر جوش زن بنایا

استھان دیوتاؤں کے ان کے ہاتھ آئے — جن میں دِیے اُنہوں نے تہذیب کے جلائے
پھر چھوڑ کر فضا کو، دنیا کو، آسماں کو — سب قوتوں نے تاکا انسان ناتواں کو
وشنو نے ان میں آکر جلوے دکھائے اپنے — نارو نے پھر ترانے ان کو سنائے اپنے
بدھ نے یہیں تو دی تھی تعلیم زندگی کی — دارو تھی پاس جس کے انسان کی بیکسی کی
یہ زندگی ہے کیسی وہ صحبتیں کہاں ہیں — رشیوں کی پُرتبسم وہ خلوتیں کہاں ہیں

بیٹے ترے گنی تھے نیکی تھی جن کی دولت
دریائے خیر کی تھی چاروں طرف روانی
ہندوستاں پیارے میں تجھ کو جانتا ہوں

(۴)

خوشبوئیں تیری اُڑ کر سارے جہاں میں پہنچیں — قومیں حریص بن کر ہندوستاں میں پہنچیں
یونانیوں نے اس کو پامال کر کے چھوڑا — ساک اور کشن نے اسکو جی دیکے مر کے چھوڑا
ہن اور سیتھین پھر اس گلستاں میں آئے — دوزخ کے رہنے والے جنت نشاں میں آئے
آیا جو ایشیا سے خنجر بدست آیا — ہندوستاں کی دولت کا بن کے مست آیا
تاراج کر کے چھوڑا اس باغ بے خزاں کو — مقتل بنا دیا اس شاداب گلستاں کو
ہیرے اگل رہا تھا ہر کوہسار تیرا — سارا چمن بنا تھا مست بہار تیرا

دنیا سے تھی نرالی تیرے چمن کی شوکت
ہر سمت بلبلوں کی جاری تھی گلفشانی
ہندوستاں پیارے میں تجھ کو جانتا ہوں

(۵)

اسلام کی شعاعوں نے پھر تجھے جگایا — تیری زمیں پہ آکر وحدت کدہ بنایا
بنکر سپوت تجھ کو گلزار کر دکھایا — مر مر کے اس چمن کو اغیار سے بچایا
بٹنے لگی یہاں پھر مے صلح و آشتی کی — رندوں نے پھر نکالی اک راہ میکشی کی
وحدت کا جام لیکر نانک، کبیر اُٹھے — اور جستجوئے حق میں شاہ و فقیر اُٹھے
شاہان دہلیہ کا جب پاؤں ڈگمگایا — مغلوں نے اس زمیں کو اپنا وطن بنایا
گودیں کھلی ہوئی تھیں تیری انہیں کی خاطر — دامن میں تیرے آکر سب بس گئے مسافر

ان کو بھی تو نے ایسا جل بیت کا پلایا
اتر کے رہنے والوں سے دیس گھر چھڑایا
چوٹیں ہزار کھائیں تیور پہ بل نہ آیا
ان فاتحوں کو تو نے مفتوح کر دکھایا

افلاک سے سوا تھی تیری زمیں میں قوت
تھی کند تیرے آگے شمشیر اصفہانی
ہندوستاں پیارے میں تجھ کو جانتا ہوں

(۶)

قسمت میں تیری لیکن اب جگ ہنسائیاں ہیں
پوتوں میں تیرے لاکھوں دل کی برائیاں ہیں
اب تیری برکتوں کی بس یہ نشانیاں ہیں
اپنے چمن میں غیروں کی حکمرانیاں ہیں
دن بھر کرے جو محنت وہ روٹیوں کو ترسے
ہن اس کی ہمتوں کا مغرب میں جا کے برسے
گھر آفتاب تھا جو بے نور ہو گیا ہے
اپنی خوشی کا منظر کافور ہو گیا ہے

اب خواب ہو گئی ہے وہ غیرت و سعادت
تیری بزرگیاں ہیں بھولی ہوئی کہانی
ہندوستاں پیارے میں تجھ کو جانتا ہوں

(۷)

اے ہند کے سپوتو! دن جا چکا ہے آدھا
سوتے رہو نہ دیکھو تم حشر تک مبادا
غفلت کی مے چڑھا کر کیوں دن گنوا رہے ہو
للہ جاگ اٹھو کیوں کسمسا رہے ہو
چنگاریاں نہ پھینکو بھارت کے خرمنوں میں
رکھا ہے کیا بتاؤ آپس کی الجھنوں میں
مکتب بدل گیا ہے تعلیم دوسری ہے
دنیا ہی دوسری ہے تنظیم دوسری ہے
ہمت بڑھاؤ اپنی زور آزماؤ اپنا
گر شوق زندگی ہے دم خم دکھاؤ اپنا
باتیں بہت بنائیں کچھ کام بھی تو کر لو
اب ہے بہار کلیاں دامن میں چن کے بھر لو

ورنہ خزاں رہیگی اس گھر میں تا قیامت
خون جگر تمہارا دنیا کرے گی پانی

مولوی غلام طیب

وفا

(۲۴)

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار! — جسکی محبت سے ہے میری روحِ وفا سرشار
اسی کی تمنا سے ہے قائم میرے دل کا قرار — جس کے خیال میں سرگرداں ہے میری جانِ نزار

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

دھویا تیری محبت نے سب میرے دل کا زنگ — اب ہوسِ دنیا باقی ہے نہ خواہشِ نام و ننگ
اور کسی سے مجھ کو محبت ہے نہ عداوت ہے — صلح ہے تیرے خیال سے میری غیر خیال سے جنگ

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

تو ہے نورِ سراپا اور ہوں میں اک مشتِ خاک — تیری محبت دریا ہے، ہوسِ دنیا خاشاک
تو ہے پاک اور تیرے شوق میں میری نگاہ بھی پاک — پھر کیوں تجھ کو سمجھنے سے عاجز ہے مرا ادراک؟

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

مہر میں تیرا جلوہ پنہاں، ماہ میں تیرا رنگ — پھر بھی اُن میں پایا میں نے تیرا رنگ، نہ ڈھنگ
تیری حقیقت بے پایاں ہے تیری حقیقت کو — کیا دیکھے گی، کیا سمجھے گی میری نگاہِ تنگ!

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

فصلِ بہار میں، ہوتی ہے جب روحِ چمن بیدار — فصلِ بہار میں کرتی ہے جب بلبل گل سے پیار
فصلِ بہار میں، چھن جاتا ہے جب ہر دل سے قرار — میرا دل بھی تیرے خیال سے ہوتا ہے سرشار

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

آہ تمنا! میری تمنا! مجھ سے فریب ہوا — مجھ کو میری محبت نے سو بار دیا دھوکا
تجھ کو نہ دیکھا تھا لیکن دیکھا، تجھ کو دیکھا — تجھ کو نہ پایا تھا۔ لیکن پایا، تجھ کو پایا

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

تیری صدا ہو کاش مجھے پیغامِ برقِ فنا! — تیری نگاہ پڑے مجھ پر بن کر پیکانِ قضا!
تیرے ستم میں حلاوت ہے، تیرا یہ سحر ہے کیا؟ — تجھ پر روح نثار مری! شیریں ہے تیری جفا

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

صبحِ ازل سے روح مری ہے اب تک سرگرداں — شامِ ابد تک یوں ہی ہوگا تیرے لئے حیراں

گو نہ ملے تو، پھر بھی رکھے گی قائم میری وفا　　　تیرا، میرا، ازل سے ابد تک رشتۂ جسم و جاں

اے محبوب! اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

حامد علی خاں

حُسنِ معصوم

اور

اس کی محافظ حور

(۲۵)

تمام بستی کو آگ، اک آتشیں ترانہ سنا رہی تھی　　　فضائے شبگوں میں سرخ شعلوں کا تند طوفاں اُٹھا رہی تھی

مکاں ہو یا مکیں ہو، ہر اک کو اک سرے سے جلا رہی تھی　　　بھڑکتی، بڑھتی، مچلتی، اُٹھتی، تڑپتی لہراتی آ رہی تھی

غریب لوگوں کے شور و شیون سے ایک ہنگامہ سا بپا تھا

خدا کا قہر ایک آتشیں سیل بن کے گویا ابل پڑا تھا

غرض، جہاں یہ مہیب شعلے ہر اک مکاں کو جلا چکے تھے　　　وہیں کسی خستہ جاں کے گھر کو بھی شعلہ ساماں بنا چکے تھے

مکیں بھی جلنے وہاں، ہر اک کا چراغ ہستی بجھا چکے تھے　　　بس ایک ننھی سی جان تھی، جس پر ابھی وہ قابو نہ پا چکے تھے

ادھر سے شعلوں میں گھر رہی تھی، اُدھر سے شعلوں میں گھر رہی تھی

یہاں وہاں، گرتی، پڑتی، دیوانہ وار کمرہ میں پھر رہی تھی

وہ اُسکا معصوم سا حسن اور وہ اُسکا چہرہ گلاب کا سا　　　وہ کچھ رسیلی کنول سی آنکھیں، وہ اُن میں نشہ شراب کا سا

وہ اُسکی بھولی سی بے حجابی، وہ اس پہ عالم حجاب کا سا　　　وہ اُسکی شاداب کمسنی، اور وہ اس کا نقشہ شباب کا سا

وہ بال جن پر گماں تھا، ان سے ہزاروں راتیں جھلک پڑیں گی

وہ لب کہ ہر دم خیال ہوتا تھا اب شرابیں چھلک پڑیں گی

وہ اک پری تھی کہ آسماں سے کوئی ستارہ اچھل پڑا تھا　　　کہ خلد کا کوئی پھول اس تیرہ خاکداں میں مچل پڑا تھا

شرابِ کوثر کا جاندار، اک حسین قطرہ ابل پڑا تھا　　　کہ ذہنِ فطرت سے اک اچھوتا خیال باہر نکل پڑا تھا

یقیناً ایسی کہ شاعر آہنگِ فکر کا منتہا بنا لیں!!

اور اس سے آگے بڑھیں تو مجھ کو خبر نہیں کیا سے کیا بنا لیں!

غرضکہ قسمت جب اُسکو ان ہولناک شعلوں میں کھینچ لائی، ستارے غصہ سے کانپ اُٹھے، زمیں ہشت سے تھرتھرائی
یہ دیکھ کر دستِ ابرِ رحمت نے اپنی دریادلی دکھلائی اشارہ پاکر بہشت سے ایک مہ جبیں حور اُتر کے آئی
خیال کی آنکھ دیکھتی ہے کہ آگ ساری بجھی پڑی ہے!!
اور ایک لڑکی پہ حور اپنے پَروں کا سایہ کئے کھڑی ہے!!

اے عشق کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہہ عالم سے، لعنت گہہ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے اس نفس پرستی سے
دور۔ اور کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

ہم پریم پجاری ہیں تو پریم کنہیا ہے
تو پریم کنہیا ہے، یہ پریم کی نیّا ہے
یہ پریم کی نیّا ہے تو اس کا کھویّا ہے
کچھ فکر نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

بے رحم زمانے کو اب چھوڑ رہے ہیں، ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں، ہم
جس آس پہ جیتے تھے اب توڑ رہے ہیں، ہم
اب تاب نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

یہ جبر کدہ آزاد افکار کا دشمن ہے

احرار کا مدفن ہے ابرار کا دشمن ہے
اشرار کا مسکن ہے اخیار کا دشمن ہے
چل یاں سے کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

آنکھوں تلے پھرتی ہے اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا
جنت کی سی سرسبز اور شاداب نما دنیا
للہ وہی لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

سنسار کے اُس پار ایک اس طرح کی بستی ہو
جو قرنوں سے انسان کی صورت کو ترستی ہو
اور جس کے مناظر پر تنہائی برستی ہو
یوں ہو تو —— وہی لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

برسات کی متوالی گھنگور گھٹاؤں میں
کہسار کے دامن کی مستانہ ہواؤں میں
یا چاندنی راتوں کی شفاف فضاؤں میں
دل چاہے وہی لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

ان چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
ان نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی نہروں میں
ٹھری ہوئی نہروں میں سوئی ہوئی لہروں میں
اے خضر حسین لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

ایسی بہشت آئین وادی میں پہنچ جائیں

جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپے پائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے آئیں
لے چل تو وہی لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

اختر شیرانی

عورت

(۱)

اسوقت یہ کھڑی ہے — گو دور آسماں سے
لیکن برس رہا ہے — کیا نور آسماں سے
اُتری ابھی ہے گویا — اک حور آسماں سے

ابرو کا ہر اشارہ — اک تیر بن رہا ہے
ہر عشوہ اک مجسم — تصویر بن رہا ہے
حسن بہار افزا — کشمیر بن رہا ہے

جلووں کی ایک دنیا — اس روئے پاک میں ہے
کیا جانے کس کا پرتو — اک مشت خاک میں ہے

(۲)

اے چشمہ محبت — اے پاسبان فطرت
تیری اک ادا سے — پیدا ہے شان فطرت
عورت ہے تو مگر ہے — روح وروان فطرت

تنویر ذات تو ہے — عکس صفات تو ہے
جسم مصوری میں — روح حیات تو ہے
دنیائے شاعری کی — کل کائنات تو ہے

ہوتی ہے مر کے زندہ   جو بار بار دنیا
ہے پائدار تجھ سے   ناپائدار دنیا
دنیا ہے تو مگر ہے   اک خوشگوار دنیا

ماضی کا سلسلہ ہے   قائم تیرے سبب سے
لیتی ہے نام تیرا   تاریخ بھی ادب سے
کیا جانیے دلوں پر   تو حکمراں ہے کب سے

دست شباب میں اک   زریں رباب ہے تو
انساں کی زندگی کا   دلچسپ خواب ہے تو
میخانہ ازل کی   کہنہ شراب ہے تو

(۳)

مغرب میں جب سراپا   فریاد ہو گئی تو
آئین بندگی سے   آزاد ہو گئی تو
جمہور کے وطن میں   آباد ہو گئی تو

مشرق کی ہیں نگاہیں   تہذیب مغربی پر
لیکن ابھی یہ بوڑھا   قائم ہے سادگی پر
خورشید ہنس رہا ہے   تاروں کی روشنی پر

عورت نہیں رہی جب   بند نقاب ٹوٹا
مے بہ گئی کہ گر کر   جام شراب ٹوٹا
آیا نمود پر اور   قصر حجاب ٹوٹا

عورت کا بے ریا دل   فطرت کا آئینہ ہے
یہ حسن کا مرقع   جنت کا آئینہ ہے
عورت کی پاک عصمت   عورت کا آئینہ ہے

کوئل

(۱)

تیری صدائے دل نشیں مست اور جنوں انگیز ہے
تیری نوائے آتشیں فریاد سے لبریز ہے
تڑپا رہی ہے دل میرا یہ پُر اثر کو کو تیری
برما رہی ہے دل میرا اے مشت پر! کوکو تیری
اسوقت نظروں سے نہاں تو اپنے کاشانے میں ہے
گونجی ہوئی لیکن تیری آواز ویرانے میں ہے
کہتے ہیں سب شاعر تجھے روح رواں فصل گل
خوش آمدی خوش آمدی اے میہمان فصل گل

(۲)

کیا ہے اگر تیری صدا اک نالہ ماتم نہیں
میں کس طرح کہدوں کہ تو مجروح تیغ غم نہیں
تقسیم غم کے واسطے ہر وقت آمادہ ہے تو
او دل گرفتہ نازنیں! کہہ۔ کسکی دلدادہ ہے تو؟
وہ کیا کشش تھی جو یہاں جنگل میں لے آئی تجھے؟
رہتی ہے کسکی جستجو اے پیک صحرائی تجھے؟
کیا تیرا دل بھی درد کی دولت سے مالا مال ہے؟
کیا تجھ کو بھی میری طرح یہ زندگی جنجال ہے؟

(۳)

سُنکر تیری میٹھی صدا کچھ جیسے کھو جاتا ہوں میں
بچپن کی یاد آتے ہی پھر معصوم ہو جاتا ہوں میں
کھوئے ہوئے فردوس کا مجھ کو پتا دیتی ہے تو

گذرے ہوئے ایام کو واپس دلا دیتی ہے تو
محفوظ ہے تیرا اثر افسون صبح و شام سے
پھر کیوں نہ تجھکو مانگ لوں میں گردش ایام سے
آموں کے برگ و بار میں تیری صدا سنتا رہوں
خوش ہو کے بچوں کی طرح میں اپنا سر دھنتا رہوں

(۴)

آ۔ دونو ملکر اُڑ چلیں اُس سرزمین پاک میں
جسکی جبیں ضو ریز ہے آئینہ افلاک میں
وہ خوشنما وادی جہاں دنیا کا کوئی غم نہ ہو
وہ جس جگہ انسان کو کچھ فکر بیش و کم نہ ہو
عشق وفا پیشہ نہ ہو رنج و الم سے آشنا
حسن جفا پیشہ نہ ہو جور و ستم سے آشنا
عمر رواں آزاد ہو زنجیر صبح و شام سے
ہر شے جہاں آزاد ہو پابندیِ ایام سے

(۵)

ہیں! یہ یکایک کیا ہوا کیوں گاتے گاتے رک گئی
وہ اُڑ چلی پر تول کر وہ شاخ دب کر جھک گئی
سوئے فضائے نیلگوں اب مائل پرواز ہے
دوش ہوا پر یا کوئی اُڑتی ہوئی آواز ہے
وہ دور مغرب کی طرف بالکل افق کے سامنے
رنگیں ہیں بادل جہاں رنگ شفق کے سامنے
بکھرے ہوئے ہیں بال و پر ساکن فضا میں ہر طرف
آزاد پھرتی ہیں جدھر چیلیں ہوا میں ہر طرف
جا پہنچی وہ اُڑتی ہوئی اُس گلشنِ بے خار میں
اور رفتہ رفتہ چھپ گئی مغرب کے لالہ زار میں

فاخر ہریانوی

غزل

غزل کے لغوی معنی عشقبازی کرنے اور عورتوں سے گفتگو کرنے کے ہیں اس میں کوئی خاص مضمون تسلسل کے ساتھ بیان نہیں کیا جاتا ہے بلکہ چھوٹے چھوٹے جدا جدا خیالات الگ الگ شعروں میں ادا کر دیئے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے غزل کے میدان میں عرب نے قدم رکھا۔ الگ نہیں بلکہ قصیدہ کے شروع میں معشوق کی تعریف میں چند اشعار ہوتے تھے۔ ان کو قصیدہ سے الگ کر لیا گیا تو غزل بن گئی۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ صورت کے ساتھ ایران میں ہوا۔ ابتدا میں غزل جوش طبع سے نہیں بلکہ اصناف شاعری کو پورا کرنے کی غرض سے وجود میں آئی۔ اگرچہ غزل قصیدہ سے ایک الگ چیز ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل کا اصلی عنصر قصیدہ ہے۔ کیونکہ قصیدہ میں ممدوح کی تعریف کی جاتی ہے۔ اور غزل میں معشوق کی۔

فارسی شاعری کا آدم رودکی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے زمانہ (تیسری صدی) میں غزل مستقل طور پر وجود میں آچکی تھی۔ سب سے پہلے حکیم سنائی نے غزل کو ترقی دی اسکے بعد اوحدی۔ عطار۔ مولانا روم اور عراقی نے اس کو معیار کمال تک پہنچا دیا۔ سعدی۔ حافظ۔ نظیری۔ عرفی اور امیر خسرو غزل گوئی کے امام ہیں۔ انہوں نے اس صنف کو بہت ترقی دی۔ تصوف۔ فلسفہ۔ اخلاق کی آمیزش سے غزل گوئی کو ایک مفید چیز بنا دیا۔

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اوّل اُردو شاعری نے دکن میں جنم لیا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں اُردو غزلیں موجود ہیں۔ اس کے بعد سعدی دکنی کا نام لیا جاتا ہے۔ جن کی غزل کے اشعار مرزا محمد رفیع سودا نے اپنے تذکرہ میں نقل کیے ہیں۔ پھر عالمگیر کے عہد میں ولی نے غزل کا چراغ جلایا۔ جو محمد شاہ کے زمانہ میں آفتاب بنکر چمکا۔ اور شاہ عالم کے زمانہ نے اس میں اور چار چاند لگا دیئے۔

شاعری کے پہلے دور میں ایہام اور ذومعنین الفاظ کی بھرمار تھی۔ لیکن ان کے کلام میں بے تکلفی تھی۔ جو کچھ دیکھتے تھے اور اس سے جو کچھ دل میں خیالات پیدا ہوتے تھے وہ اُسکو زبان قلم کے حوالہ کر دیتے تھے۔ اُلجھے ہوئے خیالات۔ دور دور کی تشبیہیں نازک استعارات ان کے یہاں نہیں۔ اسی وجہ سے اشعار صاف اور بے تکلف ہوتے ہیں۔

حاتم کی سعی سے اس دور کی رنگ آمیزی سے اُردو پاک ہوئی اور جو کچھ خامی باقی رہی تھی اُسکا قلع قمع سودا نے کر دیا۔

سودا ہی ہیں جنھوں نے اوّل اوّل دلّی میں اکثر غزلیں دلچسپ و دلپسند لکھی ہیں گرچہ زمین سنگلاخ اور قافیے بہت مشکل اختیار کیے ہیں۔ لیکن زبان صاف اور شستہ ہے۔

میر تقی میر دنیائے غزل گوئی کے بادشاہ ہیں۔ اُنھوں نے غزل میں سوز و گداز درد۔ زار نالی۔ افسردہ دلی اور دنیا سے بیزاری وغیرہ کے مضامین خوب خوب ادا کیے ہیں۔ ان کا سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک خاص انداز دکھاتا اور دماغ کو راحت تازگی بخشتا ہے۔ گھریلو زبان کو اس متانت سے ادا کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے باتیں کر رہے ہیں۔

میر درد بھی اسی میدان کے مرد ہیں۔ اور میر صاحب سے ان کا کلام ملتا ہوا ہے۔

اسکے بعد ذوق نے زبان کی پاکیزگی۔ الفاظ کی شستگی۔ اور ترکیب کی چستی سے کلام میں ایک خاص زور پیدا کر دیا۔

غالب اُردو کے بہترین شاعر شمار کیے جاتے ہیں۔ اِنھوں نے میر تقی کی اکثر

جگہوں پر پیروی کی ہے۔ لیکن وہ معنی آفرینی کے شیدائی تھے۔ اس لئے اسی میں لپٹ کر رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر غزلیں عام نظروں میں مشکل نظر آتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ اُن کی بعض غزلیں سلاست و سادگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ تشبیہ و استعارہ کی جدت اور مجاز و کنایہ کی ندرت نے ان کی غزل گوئی کو اس بلندی پر پہنچا دیا کہ کوئی اب تک اس مرتبہ کا نہ ہو سکا۔ ان کا اسلوب بیان و طرزِ ادا شوخی اور چلبلا پن بھی ایک خاص لطف رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا اُن کو پوج رہی ہے۔ اور آئے دن اُن کے دیوان کے نئے نئے اڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔

جرات نے معاملہ بندی کو خوب ترقی دی۔ انہوں نے میر تقی میر کے رنگ کو اختیار کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ اُس کی فصاحت و سادگی پر شوخی اور بانکپن کا انداز ایسا بڑھایا کہ وہ عوام میں چھا گئے۔ ان کی زبان روزمرہ اور محاورہ کی جان ہے۔

مومن خاں باوجود مشکل پسندی کے معاملہ بندی کی طرف بڑھے۔ ان کی غزلوں میں اکثر نازک خیالات اور عالی مضامین ہیں۔ استعارہ اور تشبیہ کے زور نے ان کے کلام کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ صرف فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دلکش تراشیں اُردو کی سلاست میں فرق پیدا کرتی ہیں۔

لکھنؤ میں انشا نے اپنی غزلوں کو چوں چوں کا مربا بنا دیا۔ زبان پر قدرت کامل بیان کا لطف۔ محاورہ کی نمکینی۔ ترکیبوں کی خوشنما تراشیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ان کی غزلوں میں غزلیت کے اصول کی پابندی نہیں ہے۔ لیکن جہاں پر متانت سے کام لیتے ہیں تو کلام کا رتبہ بہت بڑھ جاتا ہے۔

ان کے بعد ناسخ پیدا ہوئے۔ ان کی غزلوں میں شوکت الفاظ۔ بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے۔ تاثیر کم۔ صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترتیب دیکر ایسے نقش و نگار کرتے ہیں کہ اکثر ناصر علی اور بیدل کے حدود میں جا پڑتے ہیں۔ ان کا کلام شاعری کے عیبوں اور الفاظ کے سقم سے پاک ہے۔ اُصول کے سامنے ترکیب کی چستی اور کلام کی گرمی کا خیال نہیں کرتے۔ اہل لکھنؤ اُن پر اور اُنکے کلام پہ فدا ہیں۔

انہیں کے زمانہ میں آتش پیدا ہوئے۔ ان کا کلام محاورۂ اُردو کا دستور العمل

ہے۔ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اُن کے اشعار میں نمایاں ہے۔ جس طرح لوگ بولتے تھے اسی میں اُنہوں نے شعر کہدیئے ہیں۔ اِن کی عاشقانہ غزلوں میں ایک خاص موسیقیت ہے۔

آتش کے بعد تعشق پر اہلِ لکھنؤ کو فخر ہے۔ اگرچہ اُن کے کلام میں لکھنؤ کے خصوصیات بیشتر پائے جاتے ہیں۔ لیکن زبان صاف اور اکثر اشعار جذبات سے پر ہیں۔

آخر زمانہ میں جب نواب یوسف علیخاں بہادر اور نواب کلب علی خاں بہادر کی قدردانیوں نے ریاست رام پور کو شعرا کا مرکز بنادیا۔ تو دلّی اور لکھنو کے شعرا سمٹ کر وہاں جمع ہوگئے۔ داغ۔ امیر۔ جلال۔ اور تسلیم وغیرہ اِسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ داغ نے وہ مقبولِ عام رنگ اختیار کیا کہ اُردو دنیا میں ایک دھوم مچ گئی۔ یہاں تک کہ آخر امیر کو بھی یہی رنگ اختیار کرنا پڑا۔ ان کی آخر زندگی کے کلام میں داغ کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ وہ داغ کا پورا اتباع نہ کرسکے لیکن ان کے کلام میں اچھا خاصا تغیر پیدا ہوگیا۔

اِسی دور کے شعرا میں جلال اور تسلیم نے دلّی کی روش اختیار کی۔ اور متاخرین میں اچھا نام پیدا کیا۔

اِسی زمانہ میں جب کہ گل وبلبل کی شاعری نے اُردو کی فضا کو گندا کر رکھا تھا حالی سا مصلح شاعر پیدا ہوا۔ جس نے اُردو غزل گوئی کی اصلاح کی۔ غزل کو ایک نئے ڈھرے پر لگادیا۔ جو جو اس میں خامیاں موجود تھیں اُن کو دور کیا۔ اور کام کی باتیں سکھائیں۔

سر اقبال نے اِس صنف کی جانب کم توجہ کی۔ مگر جو دو چار غزلیں کہیں وہ اردو کی معیاری غزلیں کہی جاسکتی ہیں۔

لسان العصر اکبر مرحوم نے ابتدا میں بہت سی غزلیں کہی ہیں۔ ان کی ابتدائی غزلوں کا رنگ اُس وقت کی شاعرانہ فضا سے متاثر نظر آتا ہے۔ لیکن اخیر کی غزلیں سادگی سلاست۔ درد اور اثر سے لبریز ہیں۔

ریاض خیرآبادی نے شوخی اور رندی کے مضامین کو نہایت خوش اسلوبی

سے ادا کیا ہے۔

مولانا حسرت موہانی اس وقت متغزلین شعرا کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ انکی آخری پر سوز و گداز کا آئینہ ہے۔ وہ اپنے تمام سیاسی خیالات غزل ہی کی زبان میں ادا کرتے ہیں۔

نوبت رائے نظر اور پنڈت چکبست لکھنوی کی غزلیات میں جذبات کی پاکیزگی جھلکتی ہے۔

پنڈت کیفی۔ وحشت کلکتوی۔ عزیز لکھنوی۔ حضرت نور سہسوانی۔ مرزا یاس لکھنوی۔ حضرت اصغر گونڈوی۔ حضرت فانی بدایونی۔ اور حضرت جگر مراد آبادی حضرات نے غزل گوئی کو بہت ترقی دی۔ یہ شعرائے دہلی کے نقش قدم پر چلے اور غزل کی شاعری کو صنعتی ابتذال سے نکال کر فطری جذبات کا مرقع بنا دیا۱۔ فقط

---

۱ اس میں شعر العجم اور مقدمہ شعر و شاعری سے گونہ مدد لی گئی ہے ۱۲

غزلیاتؔ

(۱)

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا ۔۔۔ ہے مطالعہ مطلعِ انوار کا
یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا ۔۔۔ ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں ۔۔۔ تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
عاقبت ہووے گا کیا معلوم نہیں ۔۔۔ دل ہوا ہے مبتلا دیدار کا
کیا کہے تعریف دل ہے بےنظیر ۔۔۔ حرف حرف اُس مخزنِ اسرار کا
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی ۔۔۔ بند مت ہو سبحہ و زنار کا
بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں ۔۔۔ کام تھا تجھ چہرۂ گلنار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی ۔۔۔ دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولیؔ ہونا سریجن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

ولیؔ

(۲)

نین سے نین جب ملائے گیا ۔۔۔ دل کے اندر مرے سمائے گیا
نگہ گرم سیں مرے دل میں ۔۔۔ خوش نین آگ سی لگائے گیا
تیرے چلنے کی سن خبر عاشق ۔۔۔ یہی کہتا ہوا کہ ہائے گیا

سہو کر بولتا تھا مجھ سیتی بوجھ کر بات کو چھپائے گیا

آبرو ہجر بیچ مرتا تھا
مکھ دکھا کر اُسے جلائے گیا

آبرو

(۳)

خال اُس کے نے دل لیا میرا تل میں اُن نے لہو پیا میرا
جان بیدرد کو ملا کیوں تھا آگے آیا مرے کیا میرا
اس کے کوچہ میں مجھ کو پھرتا دیکھ رشک کھاتی ہے اشیا میرا
نہیں شمع و چراغ کی حاجت دل ہے مجھ بزم کا دیا میرا
زندگی دردِ سر ہوئی حاتم
کب ملے کا مجھے پیا میرا

حاتم

(۴)

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں
بادِ صبا توں عقدہ کشا اس کی ہو جیو مجھ سا گرفتہ دل اگر آوے نظر کہیں
اتنا وفور خوش نہیں آتا ہے اشک کا عالم کوں مت ڈبوئیو اے چشمِ تر کہیں
میری طرف سے خاطر صیاد جمع ہے کیا اُڑ سکیگا طایرِ بے بال و پر کہیں
تیری گلی میں خاک بھی چھانی کہ دل ملے ایسا ہی گم ہوا کہ نہ آیا نظر کہیں
رونا جہاں تلک تھا مری جان رو چکا مطلق نہیں ہے چشم میں نم کا اثر کہیں
باور اگر تجھے نہیں آتا تو دیکھ لے آنسو کہیں ڈھلک گئے لختِ جگر کہیں
ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہیں
ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے بھی ڈر کہیں

فغاں

(٥)

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا
ڈبایا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشق بدگماں اپنا

مراجی جلتا ہے اُس بلبل بے بس کی غربت پر
کہ جن نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھکو جو ہم مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جان جاں اپنا

مظہر

(٦)

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے مُنہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

باوجودے کہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

پرورش غم کی ترے یہاں تئیں تو کی دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینہ میں کہ ناسور نہ تھا

محتسب آج تو میخانہ میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی کہ شیشہ کی طرح چور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار بُرا کیوں مانے
اِس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

درد

(٧)

تھا مستعار حسن سے اُسکے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

کہا وہ تو رشک حور بہشتی ہم ہی ہیں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

میر

(۸)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُنکے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

غالب

(۹)

نہ گیا کوئی عدم کو دل شاداں لیکر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لیکر

جی ہی جی بیچ بہت شاد ہوا کرتی ہیں
تیری عارض کی بلائیں تری مژگاں لیکر

طرفہ سوجھی یہ جنوں کو ترے دیوانے کے
راہ میں پھینک دیئے خار مغیلاں لیکر

زلف و رخسار کا عالم ہے غضب ہی اُسکے
شاد ہو کیوں نہ دل گبر و مسلماں لیکر

ابر کی طرح سے کر دیوینگے عالم کو تہال
ہم جدھر جاوینگے یہ دیدۂ گریاں لیکر

پھر گئی سوئے اسیرانِ قفس بادِ صبا
خبرِ آمدِ ایامِ بہاراں لیکر

دوستی تھی بجھے ہر اک سے گئے تا در قبر
دوش پر نعش مری گبر و مسلماں لیکر

رنج پر رنج جو دینے کی ہے خو قاتل کی
ساتھ آیا ہے بہم تیغ و نمکداں لیکر

مصحفی گوشۂ عزلت کو سمجھ تختِ شہی
کیا کریگا تو عبث ملکِ سلیماں لیکر

یار بن باغ سے ہم آتے ہیں دکھ پائے ہوئے
اشک آنکھوں میں بھرے ہاتھ میں گل کھائے ہوئے

آنکھ سیدھی نہیں کرتا کہ مقابل ہو نگاہ
آرسی ناز سے وہ دیکھے ہے شرمائے ہوئے

کس کے آنے کی خبر ہے جو چمن میں گلچیں
جوں صبا چار طرف پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

ہم تو ترسے ہیں صنم اک نگہِ دور کو بھی
بخت ان کے ہیں جو ہر دم ترے ہمسائے ہوئے

حسنِ خجلت زدہ کو رنگ دکھاتا ہے نئے
آرسی بھی لسے اب دیکھے ہے للچائے ہوئے

اُسکے کوچے سے جو اُٹھ آتے ہیں ہم دیوانے
پھر اُنہیں پاؤں چلے جاتے ہیں بورلائے ہوئے

مصحفی کیوں کہ بھناں گیر ہو اُس کا جوں برق
تو سنِ ناز کو جب جائے وہ چمکائے ہوئے

مصحفی

(۱۰)

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

شگفتہ مثلِ گل ہر فصلِ گل میں داغ ہوتے ہیں
بنا ہے کیا ہمارا کالبد خاکِ گلستاں کا

سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے
کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی نظروں میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جسکے داماں کا

مرا ویرانہ مثلِ آئنہ معمورِ حیرت ہے
یقیں ہر رخنۂ دیوار پہ ہے چشمِ حیراں کا

نہ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا یا شیخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پہ تھا روئے خنداں کا

اُن لبوں کی یاد میں داغِ دلِ دیوانہ ہے
آتشِ یاقوت سے روشن چراغِ خانہ ہے

پھر بہار آئی کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے
ہر روش میں جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

ہر بگولے میں عیاں اک لغزشِ مستانہ ہے
گردشِ چشمِ غزالاں گردشِ پیمانہ ہے

ہے بیابانِ شمع روشن ہر چراغِ چشمِ غول
ہو چکا ہے بارہا آباد جو ویرانہ ہے

سرخوشی ممکن نہیں جب تک نہ چھلکے جامِ عمر
یہ خراباتِ جہاں بھی روز ہی میخانہ ہے

دیکھتے تھے کل جنھیں آنکھوں سے ہم اے غافلو
آج اُنکا اپنے کانوں کے لئے افسانہ ہے

محو ایسے خانۂ رنگیں میں مہماں ہو گئے
یہ نہیں ثابت کسی پر کون صاحب خانہ ہے

محفلِ عیشِ جہاں کا ہے دلا کیا اعتماد
نشۂ مے خواب آوازِ غنا افسانہ ہے

نال گرتا ہے کبھی اور لاش گرتی ہے کبھی
جو زچہ خانہ ہے وہ اک روز ماتم خانہ ہے

آج گو اے مہ جبینو شغل ہے تم کو یہی
چہرہ ہے اور آئینہ ہے زلف ہے اور شانہ ہے

گور سے کالے ہوتے ہیں یکرنگ مل کر خاک میں
سبزہ ہی ہوتا ہے جیسے خاک میں جو دانہ ہے

جائے آئینہ ہے گل آئینۂ زانو حسد ا
اور عوض شانے کے ٹکڑے استخوانِ شانہ ہے

شہر دم میں ہوتے ہیں آباد جن کے حکم سے
ایک دن اُنکے لئے بھی گوشۂ ویرانہ ہے

آج ہے جس کے قدم سے رونقِ باغِ جہاں
کل وہی رخصت برنگِ سبزۂ بیگانہ ہے

گرچہ بیداری میں اب ہیں دیدۂ نظارہ باز
پر کبھی یہ ماجرا اک خواب کا افسانہ ہے

اپنے کاموں میں رہو مشغول تم اے غافلو
اِسکی باتوں پر نہ جاؤ ناسخ اک دیوانہ ہے

لالہ و گل کا جوش ہے بلبلوں کا خروش ہے
فصلِ وداعِ ہوش ہے موسمِ نائونوش ہے

صدقے ہو تیری چال پر کیوں نہ نسیمِ ہر سحر
نقشِ قدم سے رہگذر دامنِ گل فروش ہے

شکل نظر نہیں پڑی آیا نہیں پیام بھی
برسوں ہوئے کہ ایک سی حالتِ چشم و گوش ہے

ناسخ قول ہے بجا حضرت میر درد کا
حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبالِ گوش ہے

ناسخ

(۱۱)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

کیا کیا اُلجھتا ہے تری زلفوں کے تار سے
بخیہ طلب ہے سینۂ صد چاک شانہ کیا؟

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا؟
اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا؟
زینہ صبا کا ڈھونڈھتی ہے اپنی مشتِ خاک بامِ بلند یار کا ہے آستانہ کیا؟
چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا؟
صیاد! اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب دکھلا رہا ہے چھپ کے اُسے آب و دانہ کیا!
طبلِ علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال ہم سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا؟
آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو دیکھیں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا؟
ہوتا ہے روز سن کے جوانمرد مدعی رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا؟
بے یار ساز دار نہ ہوگا وہ گوش کو مطرب ہمیں سناتا ہے اپنا ترانہ کیا
صیاد گل عذار دکھاتا ہے سیرِ باغ بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا
ترچھی نظر سے طائرِ دل ہو چکا شکار جب تیر کج پڑیگا اُڑے گا نشانہ کیا۔
بیتاب ہے کمال ہمارا دلِ حزیں مہماں سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا

یاں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے لکھی عاشقانہ کیا

آتش

(۱۲)

حال تغیر کیا زلف کے سودائی کا اب خدا منہ نہ دکھائے شبِ تنہائی کا
دل مایوس کے مانند پڑا جلتا ہے ہے عجب حال چراغِ شبِ تنہائی کا
ضعف اب تو ہمیں پہروں نہیں اُٹھنے دیتا یاد ایام کہ تھا زور توانائی کا
چاہتا ہوں کہ ذرا تخلیہ ہو جائے حضور حال کچھ عرض کرونگا شبِ تنہائی کا
اب ملاقات حبیبوں نہیں اُنسے ہوتی یاد آتا ہے زمانہ مجھے یکجائی کا
جو مرے واسطے جلتا ہے فدا ہوں اُسپر میں ہوں پروانہ چراغِ شبِ تنہائی کا

جس کی ہو بات مناسب ہے اسی سے کہنا
تیرہ بختی سے گلا ہے شبِ تنہائی کا

دل جو مر جائے ہمارا تو کرے کون آہیں
سو گیا جاگنے والا شبِ تنہائی کا

شب کو کیا کیا باغ میں جلوے تمہارے ہو گئے
چاندنی کے پھول جو ٹوٹے ستارے ہو گئے

برق موجیں بن گئیں موتی شرارے ہو گئے
دل جلے جب دفن دریا کے کنارے ہو گئے

دور سے جو آج مدت بعد چار آنکھیں ہوئیں
آبدیدہ ہو کے باہم کچھ اشارے ہو گئے

رات کو تیرا مجھے دھوکا ہوا اے ماہ رو
بے خودی میں چاند سے کیا کیا اشارے ہو گئے

اس نہ آنے سے تو بہتر ہے کہ آئے وقتِ نزع
کچھ تو حسرت کی نگاہوں سے نظارے ہو گئے

اے تعشق آنسوؤں میں جب ڈبویا عشق نے
تھے ہمارے آشنا جتنے کنارے ہو گئے

خلاف سب کے ہوئی کی جو آرزو تیری
پھری ہوا ادھر آنے لگی جو بو تیری

یہ اتفاق بھی دنیا میں کم سنا ہوگا
ہمارے ساتھ ہوئی دفن آرزو تیری

پڑا جو نزع میں قرآں رہی نہ جسم میں روح
زبان بند ہوئی سن کے گفتگو تیری

ہوا ہے چھوٹ کے تجھ سے دلا یہ حال اپنا
جگر پہ ہاتھ ہے ہر سمت جستجو تیری

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا
کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

صدائے نغمۂ بلبل سے دل پہ چوٹ لگی
کہ یاد آ گئی کانوں کو گفتگو تیری

مرے پہ کچھ نہیں ہے احتیاجِ چادرِ گل
دماغِ جاں میں ابھی تک بھری ہے بو تیری

تعشق

(١٣)

مٹائے گا رنگ بوستاں کا دکھا کے جور و ستم خزاں کا
اجاڑنا ہائے باغباں کا کسی کے آباد آشیاں کا

جو کوئے الفت میں عاشق آئے وہاں سے بے مر مٹے نہ جائے
غرض کہ یوں آپ کو مٹائے کہ نام ہو جائے بے نشاں کا

بہت رہے دیر میں جبیں سا حرم میں بھی لاکھ سر کو پٹکا

ہمارے سر سے گیا نہ سودا صنم ترے سنگِ آستاں کا

جب آپ سے نہاں ہوئے ہیں تو راز الفت عیاں ہوئے ہیں
جو مٹ کے خود لامکاں ہوئے ہیں سُراغ پایا ہے لامکاں کا

جو مخبرِ عشق دلربا ہے وہ اشک یا آہِ نارسا ہے
یہ راز افشا کیا ہوا ہے کسی ہمارے ہی راز داں کا

فغاں وہ کیا اور کیا وہ نالا سنے ہے جسکو نہ سننے والا
ہوا کرے لاکھ بول بالا جلال کے نالہ و فغاں کا

آج کس مست کی رخصت ہے یہ میخانے سے
شیشہ مل مل کے بہت روتا ہے پیمانے سے

کٹ گئی پاؤں کی بیڑی جو پہن کے زنجیر
ہوشیاری کوئی سیکھے ترے دیوانے سے

کر لیا مل کے جسے عشق میں تم نے اپنا
ملتے دیکھا اُسے اپنے سے نہ بیگانے سے

دیکھ سکتا نہیں دل یار سے پہلو خالی
ہم کو معلوم ہوا آنکھ کے بھر آنے سے

نہ چھپا خون کیا ہے جو ہمارے دل کا
کھل گیا اُس نگہ شوخ کے شرمانے سے

حسرتیں دل میں نکلتی ہی چلی آتی ہیں
بستیاں ہوتی ہیں پیدا مرے ویرانے سے

اُس کے آنے کی نہ ٹھہرے گی یہ ثابت ہے جلال
آپ سے آپ طبیعت کے ٹھہر جانے سے

اُس سے کچھ میرا بھی ذکر اے دل ناشاد رہے
وقت پر بھول نہ جانا یہ ذرا یاد رہے

ہم سے کتنے ہی تری راہ میں برباد رہے
تو سلامت رہے کوچہ ترا آباد رہے

قہقہے خوب لگے بے اثری پہ اُس کی
کیا مجھے شاد کیا خوش مری فریاد رہے

کامیابی ہے جسے کہتے ہیں ناکامیٔ عشق
خوش نصیبی ہے محبت میں جو ناشاد رہے

گوش زد اُس بتِ ظالم کے نہ ہوتا بہتر
نارسا یوں ہی الٰہی میری فریاد رہے

لے گئے حسرتِ دل رونقِ ہنگامۂ عشق
درد و ایذا نہ وہ اب نالہ و فریاد رہے

خیر بھولے نہیں وہ میری وفاؤں کو جلال
یہ غنیمت ہے کہ جور اپنے اُنہیں یاد رہے

جلال